ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڈھ کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

پان والی کوٹھی ، دودھپور ، علی گڈھ

۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۱۹۸۳ء

نگراں

مولانا صدر الدین اصلاحی

مدیر

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی - دودھ پور - علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی **تحقیقاتِ اسلامی** علی گڑھ

جلد ۲ | شمارہ ۱

ربیع الاول - جمادی الاول ۱۴۰۳ھ
جنوری - مارچ ۱۹۸۳ء

سالانہ زرِ تعاون

ہندوستان سے ۲۰ روپئے
پاکستان سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) ۵۰ روپئے
دیگر ممالک سے (") ۱۵ ڈالر

فی پرچہ ۵ روپئے

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لئے نودیپ آفسیٹ پرنٹرس سے چھپوا کر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

اس شمارہ کے لکھنے والے[1]

۱۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی — شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آج کل 'ہندوستان میں فکر اسلامی کا ارتقاء' پر کام کر رہے ہیں۔

۲۔ جناب عبدالباری ایم۔اے

قدیم تاریخ اور قرآن مجید خاص دلچسپی کا موضوع ہے۔ اب تک اس موضوع پر متعدد تحقیقی مقالات اردو اور انگریزی میں شائع کرا چکے ہیں۔

۳۔ مولانا صدرالدین اصلاحی — صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

مشہور اسلامی مفکر، جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے قدیم رکن۔ 'اسلام، ایک نظریہ' 'قرآنی تصور دین'، 'اسلام اور اجتماعیت'، اور 'اساس دین کی تعمیر'، جیسی ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف۔

۴۔ الشیخ عبداللہ بن محمد بن حمید

مشہور عالم دین، سعودی حکومت کی سب سے اونچی مجلس قضا کے ذمہ دار تھے۔ ابھی حال ہی میں انتقال فرمایا۔

۵۔ ڈاکٹر عبدالمغنی — بی این کالج پٹنہ یونیورسٹی بہار

T. S ایلیٹ پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اردو ادب کے مشہور نقاد اب تک اپنے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے شائع کرا چکے ہیں۔ تازہ ترین تصنیف 'اقبال اور عالمی ادب' ابھی منظر عام پر آئی ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں میں لکھتے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر اسرار احمد — ریڈر شعبۂ طبعیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۷۔ سید جلال الدین عمری — سکریٹری ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

---

[1] جن مضمون نگاروں کا پچھلے شماروں میں تفصیلی تعارف کرایا جا چکا ہے ان کا اس شمارہ میں بہت ہی مختصر اور ہماری بزم میں نئے شریک ہونے والوں کا کسی قدر تفصیل سے تعارف کرایا جا رہا ہے۔

فہرست مضامین

حرف آغاز

شریعت کی ابدیت	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

تصوف اور غیر مسنون عبادات	ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی	۱۱
المسجد الاقصیٰ اور اس کے ماحول کی قدیم تاریخ (۲)	جناب عبدالباری ایم۔ اے	۲۷

بحث ونظر

اسلام اور جاہلیت کی کشمکش	مولانا صدر الدین اصلاحی	۵۲
اسلام میں مظلوم کے حقوق	سید جلال الدین عمری	۸۵

ترجمہ وتلخیص

رویت ہلال کا مسئلہ (۲)	الشیخ عبداللہ بن محمد بن حمید (مترجم) مولانا محمد امین الاثری	۹۹

تعارف وتبصرہ

تحقیقات اسلامی پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالمغنی	۱۱۱

استدراک

	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

شریعت کی ابدیت

سید جلال الدین عمری

بعض لوگوں کا خیال ہے اور اس خیال کو مختلف حلقوں سے اسلوب بدل بدل کر پیش کیا جاتا رہتا ہے کہ شریعت ایک خاص وقت اور ماحول میں نازل ہوئی تھی۔ اب وہ دور اور حالات باقی نہیں رہے اور ہمیں ایک نئی صورت حال کا سامنا ہے اس لئے شریعت کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس میں مناسب اصلاح اور ترمیم نہیں کی گئی تو وہ دورِ جدید کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور امت کے لئے موجودہ پستی سے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ بعض لوگ یہ بات کھل کر تو نہیں کہتے لیکن اپنی اس خواہش میں مضطرب اور بے چین ضرور نظر آتے ہیں کہ شریعت کو کسی نہ کسی طرح دورِ جدید سے ہم آہنگ کر کے دکھائیں تاکہ شریعت کا نام لینے والوں کو یا کم از کم خود ان کو اس کی ناموزونیت سے پشیمانی نہ اٹھانی پڑے۔ اس کے لئے انہیں شریعت کی ایسی تعبیر و تفسیر کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا جو زبان و بیان، اس کی مستند تشریحات اور امت کے تعامل سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔

ان خیالات کا تعلق شریعت کے کسی خاص مسئلہ سے نہیں بلکہ خدا کی شریعت جتنی وسیع و ہمہ گیر ہے ان کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع و ہمہ گیر ہے کسی کو اس کے نظامِ عبادت میں نقص نظر آتا ہے، کوئی اس کی معاشرت کو بدلنا چاہتا ہے، کسی کو اس کی تہذیب و ثقافت میں رفوگری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کوئی اس کی معاشی تعلیمات میں پیوندکاری کا مشورہ دیتا ہے، کوئی اس کے حدود و تعزیرات کی وحشت و بربریت دور کرنا چاہتا ہے۔ اگر ان سب خیالات کو ایک خاص

ترتیب سے یکجا کردیا جائے تو اس کی ایسی بھیانک تصویر بنے گی کہ اس کی طرف شوق و رغبت سے بڑھنے کی جگہ آدمی اس سے دور بھاگے گا بلکہ اسے اس میں بھی شک و شبہ ہونے لگے گا کہ وہ واقعتاً خدائے رب العزت کی طرف سے آئی بھی ہے یا نہیں؟

ان خیالات کا اظہار اسلام کے کسی منکر یا مخالف کی طرف سے ہو تو اسے شریعت کی معنویت سمجھائی جا سکتی ہے اور وقت ضرورت کسی نہ کسی درجہ میں اس کی کوشش ہوتی بھی رہتی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات بعض اوقات ان لوگوں کی طرف سے سامنے آتے ہیں جو خود کو اسلام کے ماننے والے اور اس کے ہمدرد و بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالانکہ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ شریعت کسی انسان کی تصنیف کردہ نہیں بلکہ خدا کی اتاری ہوئی ہے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی کی طرف سے اس کی تشریح و توضیح کی ہے وہ کبھی بھی ان خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہاں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کو کس حیثیت سے پیش کیا ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے صاف و صریح الفاظ میں اعلان فرمایا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ	آج میں نے تمہارے لئے تمہارے
دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ	دین کو مکمل کردیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام
دِیْنًا ؕ (مائدہ: ۳)	کو دین کے طور پر میں نے پسند کرلیا۔

آیت میں 'دین' کا لفظ آیا ہے جس میں شریعت بھی داخل ہے بلکہ بعض احکام شریعت کے سیاق و سباق ہی میں یہ آیت آئی ہے۔ اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ شریعت ہر پہلو سے مکمل ہو چکی ہے۔ اب نہ تو کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ اس میں قیامت تک کسی قسم کا حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ ہوگی۔ یہ ختم نبوت کی بھی دلیل ہے اس لئے کہ شریعت میں چھوٹی یا بڑی کوئی بھی تبدیلی پیغمبروں ہی کے ذریعہ آتی ہے۔ جب ایک ابدی شریعت آگئی تو کسی نئے پیغمبر کی ضرورت

بھی باقی نہیں رہی۔ اب شریعت میں کسی حذف و اضافہ کا مطلب صرف یہی نہیں ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی ختم نبوت کو نہ مانا جائے بلکہ یہ خود کو مقام نبوت پہونچانے کے مترادف بھی ہوگا۔

اس آیت کی حافظ ابن کثیرؒ نے بڑی عمدہ اور پُرمعنی تشریح کی ہے یہاں اس کا خلاصہ ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اس کے لئے اپنے دین کو اس طرح مکمل کر دیا کہ اب اسے کسی دین کی اور اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اور (سارے ہی) جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ لہٰذا حلال صرف وہ ہے جسے آپ نے حلال ٹھہرایا اور حرام صرف وہ ہے جسے آپ نے حرام کہا۔ دین بس وہ ہے جو آپ نے بتایا جس بات کی بھی آپ نے خبر دی وہ حق ہے اور سچی ہے۔ اس میں نہ جھوٹ ہے اور نہ اس کے واقع ہونے میں کوئی شبہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا تو گویا اس امت پر اپنی نعمت بھی مکمل کر دی۔ لہٰذا اسے اس نعمت پر خوش اور مطمئن ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں آیت میں دین سے مراد اسلام ہے۔ اللہ نے اپنے نبی اور مومنوں کو اس میں بتایا ہے کہ اس نے ان کے ایمان کو مکمل کر دیا۔ اب اس میں انھیں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس نے اسے مکمل کر دیا اب اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا اور اسے اس نے پسند کر لیا اب اس سے کبھی ناخوش نہ ہوگا (ابن کثیر ۲/۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات پر یقین ہو وہ دین میں کسی حذف و اضافہ اور نقص کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تکمیل دین اور ختم نبوت نے اس کے نزدیک اس امکان ہی کو قیامت تک کے لئے ختم کر دیا ہے۔

یہ تو ایک اصولی بات ہوئی۔ اس پر بعض اور پہلوؤں سے بھی غور ہو سکتا ہے۔

شریعت کا ایک اہم مقصد خدا کی طرف سے حرام اور حلال کی تعیین بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے وہ ساری چیزیں حلال کر دی ہیں جو طیب اور پاک ہیں، جن کو اس کی فطرت سلیم

پسند کرتی ہے، جو اس کی جسمانی صحت اور اخلاق و روحانیت کے لئے مفید ہیں۔ اسی طرح اس نے ان تمام چیزوں کو حرام ٹھہرادیا ہے جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے جو اس کی صحت اور کردار پر برا اثر ڈالتی ہیں اور جو خبیث اور ناپاک ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وصف اس نے یہ بیان فرمایا کہ "وہ ساری پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں"۔ (الاعراف: ۱۵۷)

رہبانیت نے پاک چیزوں کو بھی حرام قرار دے رکھا ہے۔ اسلام نے اسے غیر الٰہی طریقہ بتایا اور کہا "کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے پوچھو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زیب و زینت نکالی ہے اور کھانے کی صاف ستھری چیزیں پیدا کی ہیں انھیں کس نے حرام کیا؟ ان سے کہو اس دنیا کی زندگی میں یہ اصلاً ایمان والوں ہی کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص ان ہی کے واسطے ہوں گی"۔ (الاعراف: ۳۱-۳۲)

اس نے یہ بھی کہا کہ "جو چیزیں اللہ نے تم پر حرام کی ہیں اس نے تفصیل سے وہ تمہیں بتادی ہیں"۔ (الانعام: ۱۱۹)

اس کے ساتھ اس کے نزدیک یہ صرف خدا کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی حلت یا حرمت کا فیصلہ کرے۔ کسی دوسرے کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے۔ اس نے صاف کہا "تمہاری زبانیں جو جھوٹ بولتی ہیں ان کی بنا پر یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ چند روزہ سامانِ زیست ہے اور اس کے بعد ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔ (النحل ۱۱۶-۱۱۷)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اس حکم میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے بغیر کسی سندِ شرعی کے نئی بات پیدا کی یا محض اپنی رائے اور خواہش کی بنا پر اللہ نے جس چیز کو حلال کیا اسے حرام قرار دیا اور جسے اس نے حرام ٹھہرایا اسے حلال کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۵۹۰)

جب کوئی شخص حلت و حرمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے اور صرف خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے کا فیصلہ کرے اور اس نے اس کی تفصیل بھی کردی ہے تو پھر شریعت میں حذف و اضافہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (یہاں اس اجتہاد سے بحث نہیں ہے جو شریعت کے حلال و حرام کی روشنی میں ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس کے تابع ہوتا ہے)

ایک اور پہلو سے اس مسئلہ پر سوچئے۔ احکام شریعت کو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر "حدود اللہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔ روزے کے احکام کے ذیل میں فرمایا "یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ"۔ (البقرہ: ۱۸۷) طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا "یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ ان سے آگے مت بڑھو"۔ (البقرہ: ۲۲۹) اسی بیان میں آگے فرمایا "یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں جنھیں وہ جاننے والوں کے لئے بیان کرتا ہے"۔ (البقرہ: ۲۳۰) طلاق ہی کے احکام کے ذیل میں ایک اور جگہ فرمایا "یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ جو ان حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے"۔ (الطلاق: ۱) ان حدود کی پابندی پر جنت کی خوشخبری اور ان کی خلاف ورزی پر جہنم کی وعید سنائی۔ چنانچہ میراث اور وصیت کے احکام کے سلسلہ میں فرمایا "یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے وہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے گا اسے وہ جہنم کی آگ میں داخل کرے گا جن میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسواکن عذاب ہے"۔ (النساء: ۱۳، ۱۴)

زندگی کے مختلف معاملات میں اللہ تعالیٰ نے جو حدود قائم کئے ہیں، جن کی پابندی کی اس نے اتنی تاکید کی ہے اور جس سے تجاوز اور خلاف ورزی کو اس نے اتنی شدت سے منع کیا ہے کیا کوئی مسلمان ان سے قدم باہر رکھنے کی کبھی ہمت کرسکتا ہے اور اگر غفلت میں کبھی ان حدود کو توڑ دے تو اسے جائز قرار دے سکتا ہے یا کسی کو ان کے توڑنے کا مشورہ

دے سکتا ہے؟

عرب کے مشرکوں کے بارے میں قرآن نے کہا "جب انھیں ہماری صاف صاف آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس کو بدل ڈالو۔" جو لوگ خدا کے دین اور شریعت میں تبدیلی چاہتے ہیں غالباً ان کی ذہنیت بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ قرآن نے عرب کے مشرکین کے اس مطالبہ کے جواب میں کہا کہ خدا کے دین میں تبدیلی اس کا پیغمبر بھی نہیں کرسکتا "ان سے کہہ دو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو بس اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔" (یونس: ۱۵)

کیا اس جواب کے بعد بھی کسی صاحبِ ایمان کی طرف سے شریعت میں تبدیلی کا سوال اٹھایا جا سکتا ہے؟

نوادرات مولانا جلیل احسن ندویؒ کمیٹی

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح نے مولانا جلیل احسن ندویؒ کے نوادرات کی فراہمی کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جس کے ذمہ مولانا مرحوم کے مخطوطات، مضامین اور فتاوی وغیرہ حاصل کرنا ہے تاکہ مولانا مرحوم پر باضابطہ کام کیا جا سکے۔ متعلقہ کمیٹی ان تمام افراد اور اداروں سے اپیل کرتی ہے جن کے پاس مولانا کے مخطوطات، مضامین، فتاوی وغیرہ موجود ہوں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر ان کو ہدیۃً یا عاریۃً ارسال فرمائیں واپسی کی شرط کی صورت میں متعلقہ چیز انشاء اللہ پوری حفاظت سے واپس کردی جائے گی۔ والسلام

کنوینر: خالد حامدی

پتہ: ادارہ شہادتِ حق، ۱۸۸۱ گلی پتّے والی، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تحقیق وتنقید

تصوف اور غیر مسنون عبادات

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلّی

تصوف محض کوئی نظریاتی تصور نہیں ہے بلکہ ایک پورا نظام فکر وعمل ہے۔ اپنی نشو ونما اور ارتقاء کے ابتدائی ادوار میں یہ تربیت اور تزکیہ نفس کا ایک سیدھا سادہ طریقہ تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک ضابطہ حیات اور سسٹم کی شکل اختیار کرتا چلا گیا جس کا دائرہ اثر واختیار پوری زندگی پر محیط تھا۔ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ ہونے کے معنی صرف یہی نہیں تھے کہ کچھ مخصوص اوراد و وظائف کی پابندی اختیار کرلی جائے، ایک خاص انداز میں تربیت اور تزکیہ نفس کا اہتمام کیا جائے اور ایک خاص روحانی کیفیت کو اپنی زندگی میں جاری وساری کرلیا جائے، بلکہ زندگی کے تمام ظاہری مظاہر کو بھی ایک مخصوص قالب میں ڈھال لیا جائے۔ صوفیہ کی شناخت اپنے مخصوص انداز، مخصوص آداب اور رسوم، مخصوص لباس وضع وقطع، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ایک مخصوص نہج کی وجہ سے عامۃ المسلمین سے الگ ایک گروہ اور طبقہ کی حیثیت سے کی جانے لگی جن کے اچھائی برائی، حسن وقبح اور معیشت ومعاشرت کے معیار اور پیمانے عام طور پر امت کے جانے پہچانے پیمانوں سے الگ اور ممتاز تھے۔

شمالی ہندوستان میں جب مسلم حکومت کی بنیاد پڑی اور برصغیر میں تصوف کو قبولِ عام حاصل ہوا اس وقت تک تصوف ایک منضبط نظام کی شکل اختیار کرچکا تھا جس میں آداب ورسوم اور قواعد وضوابط نیز اوامر ونواہی اور خوب وناخوب کی ایک طویل

فہرست تھی۔ ایک صوفی کے انداز و اطوار کیا ہوں، لباس اور ظاہری کیفیات کیسی ہوں، اہل و عیال اور معاشرہ سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہو، اپنے مرشد سے تعلق کی کیفیت کیا ہو، راہ سلوک کے دوسرے رفقاء سے معاملات کا انداز اور نہج کیا ہو، نیز عام بشری ضروریات، کھانے پینے، سونے، جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، سفر و حضر، کسب و ملازمت ازدواج و تجرد، غرض کہ ہر ممکن شعبۂ زندگی سے متعلق آداب و رسوم کا ایک پورا سلسلہ ہے جس سے نظام تصوف میں بحث کی جاتی ہے۔ کشف المحجوب، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف اور اصول تصوف کی دوسری کتابوں میں ان آداب و رسوم کو پوری شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے آداب و رسوم ایسے ہیں جن کا سراغ کتاب و سنت میں نہیں ملتا۔ یہ اکابر صوفیہ کی زندگیوں سے متعلق واقعات اور ان کی تعلیمات و تجربات سے ماخوذ ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں ان آداب کو رسوم متصوفانہ اور رسوم ظاہرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ سفر سے واپسی کے سلسلے میں صوفیوں کے آداب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان آداب کو مشائخ نے پسند فرمایا ہے (استحسان مشائخ) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ان میں سے بہت سی چیزوں کے پابند نہ تھے۔[1] اسی ضمن میں ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وللقوم آداب وردبھا	صوفیہ کے کچھ آداب تو وہ ہیں جو
الشرع ومنھا آداب	شرع میں مذکور ہیں اور کچھ وہ ہیں
استحسنھا شیوخھم[2]	جنھیں ان کے مشائخ نے پسند فرمایا ہے۔

گویا آداب و تعلیمات تصوف میں ایسی چیزیں موجود ہیں اور انھیں مشائخ نے پسند فرمایا ہے جن کی اصل کتاب و سنت میں نہیں ہے اور جو صحابہ کرامؓ کی مبارک زندگیوں

---

[1] ملاحظہ کیجئے عوارف المعارف علی ہامش احیاء علوم الدین للغزالی، مصر، ۱۹۳۹ء ص ۱۴۵

[2] عوارف المعارف، ۱۲۹

میں، جنھوں نے دامن رسالت ؐ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی اور براہ راست فیضان نبوت سے اکتساب فیض کیا تھا، نہیں پائی جاتیں۔

صوفیانہ زندگی کا جزء اعظم عبادات اور اوراد و اذکار پر مشتمل ہے۔ جب ہم ان عبادات اور اوراد و اذکار کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں جن پر اکابر صوفیہ خود عمل پیرا تھے اور جن کی تاکید و تعلیم اپنے مریدین و متوسلین کو کرتے تھے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بہت سی چیزوں کی اصل ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ان کے اصحابؓ کرام کی مبارک زندگیوں میں نہیں ملتی۔ اذکار و اوراد کا باب زیادہ وسیع ہے اور صوفی لٹریچر میں اس باب خاص کے بارے میں مواد اتنا وسیع اور متنوع ہے کہ اس موقع پر اس سلسلے میں گفتگو ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک محدود بحث کو لیا گیا ہے اور اکابر چشتیہ کے عمل اور تعلیمات میں جن نمازوں کا ذکر ملتا ہے اور جن کی اصل کتاب و سنت میں نہیں ہے گفتگو صرف انھیں تک محدود رکھی گئی ہے۔ ماخذ کے اعتبار سے یہ بحث صرف دو مستند چشتی ماخذ "فوائد الفواد" اور "سیر الاولیاء" تک محدود رکھی گئی ہے جیسا کہ معلوم ہے "فوائد الفواد" سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا نہایت مستند مجموعہ ہے[1] "سیر الاولیاء" ابتدائی چشتی مشائخ کی سوانح حیات اور تعلیمات و تجربات کا بہترین ماخذ ہے[2]، مورخین و صوفیہ دونوں

---

[1] اس مجموعہ کے مولف مشہور ادیب و شاعر اور سلطان المشائخؒ کے مرید امیر حسن سجزی ہیں۔ اس میں ۷۰۷ھ سے ۷۲۲ھ (۱۳۰۷ء - ۱۳۲۲ء) تک کل ۱۸۸ مجالس کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور درمیانی وقفوں کے ساتھ ۱۵ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے آغاز کے وقت شیخ کی عمر ۶۰ سے تجاوز ہو چکی تھی۔ نول کشور، مطبع حسنی اور ہند وپریس سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ محمد لطیف ملک نے اس کا جدید ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں لاہور سے شائع کیا ہے اور یہی ایڈیشن پیش نظر ہے۔

[2] اس کے مولف سید محمد بن مبارک علوی کرمانی ہیں جو امیر خورد کے نام سے زیادہ مشہور

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

ہی انھیں مستند تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مجموعہ ملفوظات "خیر المجالس[۱]" کا تعلق ہے اس میں اس قسم کی نمازوں کا ذکر شاذونادر ہی ملتا ہے۔

وہ نمازیں جو، علاوہ نوافل کے جن کا کوئی مخصوص نام نہیں ہے، چشتی مآخذ میں مذکور ہیں اور جن کی تعلیم مشائخ چشت خصوصاً سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدین اور متوسلین کو دیتے تھے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں صلوٰۃ السعادت، صلوٰۃ البروج صلوٰۃ النور، صلوٰۃ الخضر، صلوٰۃ اویس قرنی، صلوٰۃ الصلوات، صلوٰۃ العاشقین، صلوٰۃ القربہ، صلوٰۃ صحۃ النفس، نماز بجہت نگاہ داشت ایمان، نماز برائے درازی عمر، نماز برائے روشنی چشم اور نماز لیلۃ الرغائب وغیرہ۔ بدقسمتی سے تفصیلی معلومات ان میں سے صرف چند کے بارے میں دستیاب ہیں۔ باقی کا صرف نام یا کسی قدر جزوی معلومات ہی مل سکی ہیں۔ بہرحال جو معلومات ان مآخذ سے حاصل کی جاسکی ہیں ان کی روشنی میں ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ایک بنیادی سوال اس سلسلہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نمازوں کی اصل کیا ہے اور ان کا منبع و مآخذ کیا ہے؟ یہی سوال 'فوائد الفواد' کے مولف امیر حسن سجزیؒ نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے پوچھا تھا۔ یہ سوال اور جواب ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں تاکہ دین

ہیں۔ خاندانی طور پر مشائخ چشت سے متعلق و وابستہ تھے اور بہایت کم عمری میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کا ایک ایڈیشن مطبع محب ہند سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ اسی ایڈیشن کو موسسہ انتشارات اسلامی لاہور نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا ہے یہی ایڈیشن پیش نظر ہے۔

[۱] خیر المجالس کے مولف مولانا حمید قلندر شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ اس میں شیخ کی ۱۰۰ مجلسوں کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں اور عہد ۱۳۵۳ھ کے بعد کا ہے اس کا انتقادی متن پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔

کے بنیادی مسائل کے متعلق صوفیہ کے طرز عمل کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکے۔ حسن سجزی لکھتے ہیں:۔

چوں ماہ رجب نزدیک رسید بود
بندہ عرضداشت کرد کہ خواجہ اویس
قرنی رضی اللہ عنہ نمازے کہ فرمودہ است
در سوم ماہ رجب و چہارم و پنجم بندہ
را در خاطر می گذرد کہ ہر بزرگے نمازے
و دعائے کہ فرمودہ است از حضرت
رسالت ﷺ شنیدہ است یا از صحابہ کرام
خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ ایں
نماز ہا کہ فرمودہ است و سورتہا تعین
کردہ و دعا ہا مسمی کردہ از کجا است؟
خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ ایں
معانی از الہام ہم شد[1]

چوں کہ ماہ رجب قریب تھا بندہ نے
عرض کیا کہ خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ
نے جو نماز رجب کی تیسری، چوتھی اور پانچویں
کو فرمائی ہے اس سلسلہ میں یہ بات ذہن
میں آتی ہے کہ ہر بزرگ جس نے کسی
نماز یا دعا کا حکم دیا ہے اسے یا تو
حضرت رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے
سنا ہے یا صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)
سے سب جو خواجہ اویس رضی اللہ عنہ نے
ان نمازوں کے لئے جو فرمایا ہے اور ان میں
سورتوں اور دعاؤں کا تعین کیا ہے اس کی بنیاد
کیا ہے؟ حضرت خواجہ نے فرمایا یہ چیزیں
الہام سے بھی ہوتی ہیں۔

اس جواب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صلوٰۃ اویس قرنی کے علاوہ بھی جو نمازیں ان بزرگوں کی تعلیمات میں پائی جاتی ہیں اور جن کا کوئی ثبوت کتاب و سنت میں نہیں ملتا ان کا ماخذ اور منبع بھی الہام ہی ہو سکتا ہے۔ گویا عبادات جیسے بنیادی اہمیت کے مسائل تک میں نصوص کتاب و سنت کے علاوہ ایک اور اصل الہام بھی ہے۔ حالانکہ علم دین کے سلسلہ میں یہ بات عام معلومات کا درجہ رکھتی ہے کہ تعبدات اور

۱؎ فوائد الفواد، ص۲۲۶-۲۲۷

قربات کے سلسلہ میں صرف کتاب وسنت کے واضح نصوص پر ہی بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ رائے، کشف یا الہام کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔[1] چونکہ انسانی زندگی تغیر پذیر ہے اس لئے اس کے بدلتے ہوئے حالات کے لئے احکام کی حکمت اور علت کی روشنی میں نئے مسائل واحکام کے استنباط اور نئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اجتہاد کا کام ہمیشہ جاری رہے گا۔ لیکن جہاں تک قربات وتعبدات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کسی قیاس اور رائے کی کارفرمائی ممکن نہیں اور نہ ہی نئی عبادات کا دروازہ کھولنے کے لئے کشف والہام کا سہارا لیا جاسکتا ہے بلکہ صرف اور صرف کتاب وسنت کے واضح نصوص ہی کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے اور ان سے تجاوز وانحراف کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح شارع نے دین میں جن امور کو جو درجہ دیا ہے ان کو اسی درجہ میں رکھنا ضروری ہے۔[2] مستحب کو فرض کا درجہ دینا دین کی منشا کی صریح خلاف ورزی ہے اور احداث فی الدین کے زمرہ میں شامل ہے۔[3]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی مقبولیت کا راز مشائخ چشت کی اس صلاحیت کو قرار دیا ہے جس کی بدولت وہ یہاں کے حالات، یہاں کے لوگوں کے مذہبی نقطۂ نظر نیز ان کی آرزوؤں اور امنگوں کو سمجھنے کے قابل ہوسکے تھے۔ ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے ارتقاء کے ابتدائی ایام میں انھوں نے بہت سے ہندو مراسم کو اختیار کر لیا تھا۔ شیخ کے سامنے سرنگوں ہونا، زائرین کی پانی سے تواضع، زنبیل گردانی، نئے مریدین کی سرتراشی،

---

[1] اس سلسلہ میں مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ جمع وترتیب عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم، مکتبۃ المعارف، الرباط، جلد ١ ص ٦٦-٦٥۔ عبدالوہاب خلاف، علم اصول الفقہ، ص ٦٢، ذکی الدین شعبانی، اصول الفقہ الاسلامی، ص ١٣٩، ہدایہ، جلد ١ ص ٧

[2] مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ، جلد ١١ ص ٤٥٠-٥١

[3] خیر المجالس ص ٢١٦-١٧

سماع کی محفلیں، اور چلہ معکوس ہندو اور بدھ رسوم سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں اور یہی سبب ہے ہندوستان کے غیر مسلم ماحول میں چشتی سلسلہ کی مقبولیت کا[1] گویا وہ اعمال و رسوم جن کی اصل کتاب و سنت میں نہیں ملتی وہ مقامی ہندو فلسفوں اور مذہبی رسم و رواج سے متاثر اور ماخوذ ہیں اور یہی اخذ و تاثر چشتی سلسلہ کی مقبولیت کا بنیادی سبب ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ بھی بظاہر اس قسم کے اضافوں کو ہندوستان کے مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر بتاتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں "ہندوستان کے مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانے کے مشہور و مقبول شطاری بزرگ شیخ محمد غوث شطاری" کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث کے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے[2]"۔ ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں "یہ صرف 'جواہر خمسہ' کی خصوصیت نہیں بزرگوں کے ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں[3]"۔

تحقیق و جستجو سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس قسم کی چیزیں مثلاً مختلف دنوں اور مہینوں کی فضیلت اور ان میں مخصوص دعاؤں، نمازوں، عبادات اور اعمال کی تلقین جن کا

---

[1] SOME ASPECTS OF RELIGION AND POLITICS IN INDIA DURING THE THIRTEENTH CENTURY ALIGARH, 1961 PP 178—79

[2] تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ چہارم ص ۲۴۴

[3] مولانا ابوالحسن علی ندوی، حدیث کا بنیادی کردار ص ۳۳

کتاب و سنت میں کوئی ثبوت نہیں ہے صرف ہندوستان تک محدود نہ تھیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کے صوفی حلقوں میں بھی رائج و مقبول تھیں[1] نیز اس قسم کی تعلیمات صرف غیر مستند مجموعوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ نہایت مستند مجموعوں میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ شطاریوں پر تو ہندو فلسفہ کی چھاپ کا معاملہ قابل فہم ہے لیکن ابتدائی چشتی مشائخ کے بارے میں یہ بات چنداں وزن نہیں رکھتی۔ اس ابتدائی دور میں جوگیوں وغیرہ سے رابطے کی بعض مثالیں چشتی مآخذ میں موجود ہیں[2] لیکن ان کی نوعیت نہایت محدود ہے اور ان سے اتنے بنیادی اثرات مرتب ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ قرائن اسی بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ اعمال و تعبدات خود تصوف کے اپنے اندر کی پیداوار ہیں اور عبادات کے سلسلہ میں غلو اور انتہا طلبی کا نتیجہ ہیں۔

صوفی لٹریچر میں ماہ رجب کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ امیر حسن سجزی نے اس سلسلہ میں سلطان المشائخ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے:۔

فرمود کہ دریں ماہ دعاہا بسیار مستجاب	فرمایا کہ اس مہینے میں دعائیں زیادہ مقبول
شود، و چہار شب دریں ماہ بسیار	ہوتی ہیں۔ اس مہینے میں چار راتیں بڑی
بزرگ است یکے شب اول، دوم شب	باعظمت ہیں۔ ایک تو پہلی رات، دوسری پہلے
آدینہ اول، سوم شب پانزدہم، چہارم شب	جمعہ کی رات، تیسری پندرہویں رات
بست و ہفتم کہ شب معراج است[3]	اور چوتھی ستائیسویں رات جو کہ معراج کی
	رات ہے۔

---

[1] مثال کے طور پر دیکھئے مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ، جلد ۱۱، ص ۵۷۹-۵۷۸، ابن قیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، دار الکتاب العربی، بیروت، جزء اول، ص ۱۱۵، ۱۶۲-۱۶۳

[2] فوائد الفواد، ص ۸۳، ۸۴، ۱۴۴، ۴۰۵، ۴۱۷-۱۸، خیر المجالس ص ۶۰

[3] فوائد الفواد ص ۹۶،۹۵، ماہ رجب میں روزے کی بھی صوفیہ کے یہاں بہت تاکید پائی جاتی ہے

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

اس مہینے میں دوسری بہت سی عبادات کے علاوہ ایک خاص نماز بھی ادا کی جاتی ہے جسے نماز اویس قرنی کہتے ہیں، سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس نماز کی تعلیم حضرت اویس قرنیؒ نے دی، انھوں نے ہی اس کی رکعات متعین کیں اور مختلف رکعات میں پڑھی جانے والی سورتوں اور دعاؤں کا تعین بھی کیا[1] فوائد الفواد' میں ایک جگہ اس نماز کے لئے تیسری، چوتھی اور پانچویں تاریخ کی نشاندھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تیرہویں، چودھویں، پندرہویں نیز تیئسویں، چوبیسویں اور پچیسویں کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے[2] سلطان المشائخ اس نماز کی بڑی فضیلت بیان فرماتے تھے۔

بعد ازاں در فضیلت ایں نماز بسیار مبالغت فرمود[3]	پھر اس نماز کی فضیلت میں بہت مبالغہ فرمایا۔

چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو کوئی رجب کے پچیس روزے رکھے اسے اس نعمت سے حصہ نصیب ہوگا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج ملا تھا۔ ماہ رجب کے لئے ایک خاص استغفار بھی ہے استغفر اللہ ذا الجلال والاکرام من جمیع الذنوب والآثام جو کوئی ماہ رجب میں ہزار بار کہے تو خداوند قدوس فرماتا ہے کہ میں اس کا رب نہیں اگر میں اسے بخش نہ دوں۔ اور یہ وہ تین بار فرماتا ہے، ملاحظہ کیجئے سیر الاولیاء صـ۳۹ اس سلسلہ میں حافظ ابن قیم لکھتے ہیں ولا صام رجبا قط ولا استحب صیامہ بل روی عنہ النہی عن صیامہ۔ ذکرہ ابن ماجہ، ملاحظہ کیجئے زاد المعاد، حصہ اول صـ۱۶۳، ۱۶۴، نیز دیکھئے مجموع فتاوی شیخ الاسلام، جلد ۱۱ صـ۵۷۹، عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، التحذیر من البدع - الریاض صـ۱۰۸

[1] فوائد الفواد، ۲۸-۳۲۷

[2] فوائد الفواد، صـ۳۸-۳۷، ۲۸-۳۲۷، سیر الاولیاء صـ۳۹۸

[3] فوائد الفواد صـ۳۷، سیر الاولیا صـ۳۹۸

اس سلسلہ میں مدرسہ معزی کے ایک دانشمند مولانا زین الدین کا ذکر بھی فرمایا جن پر اس نماز کی برکت سے بغیر کسی تعلیم کے علم کے دروازے کھل گئے تھے[1]۔ علاوہ ازیں اسی مہینے کے آخر میں ایک اور نماز کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نماز درازئ عمر کے لئے پڑھی جاتی تھی۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ اور مشہور چشتی بزرگ شیخ بدر الدین غزنوی یہ نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ یہ نماز بارہ رکعت ہوتی ہے اور چار چار رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں ایک بار آیۃ الکرسی اور تین بار سورہ اخلاص پڑھنی چاہئے۔ نماز کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے

یا اجل من کل جلیل ویا اعز من کل عزیز یا احد خیر من کل احد، انت ربی لا رب لی سواك، یا غیاث المستغثلین ورجاهم اغنني بفضلك ومدفی عمری مدا ..... عمرانی رضاك برحمتك یا کریم یا وهاب[2]

شیخ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ شروع میں شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے انھیں چھ رکعت نماز اشراق کی تعلیم دی تھی اور یہی طریقہ وہ اپنے مریدین کے ساتھ اختیار کرتے تھے۔ جہاں تک نماز اشراق کا تعلق ہے اسے عموماً سنت تسلیم کیا جاتا ہے[3] لیکن آٹھ رکعتوں میں سے ہر دو رکعت کا ایک الگ نام اور ان کے اندر پڑھنے کی سورتوں کی تعیین کی اصل سنت میں نہیں ملتی۔ پہلی دو رکعتیں "شکرانہ خداوندی" کی ہیں۔ پہلی رکعت میں بعد از فاتحہ آیۃ الکرسی وہم فیہا خالدون تک اور دوسری رکعت میں آمن الرسول سے آخر تک اور اللہ نور السموات والارض سے واللہ بکل شی علیم تک۔ پھر دو رکعت "استعاذہ" کی ہیں۔ اس میں پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد قل اعوذ برب الفلق اور دوسری رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھنی چاہئے۔ پھر دو رکعت "استخارہ" کی ہے۔ اس میں پہلی رکعت میں

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۶-۲۷، سیر الاولیاء ص ۳۹۸ [2] سیر الاولیاء ص ۳۹۸

[3] امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اسے سنت مانتے ہیں۔ امام مالکؒ اسے سنت نہیں مانتے بلکہ مندوب قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے عبدالرحمٰن الجزیری کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، قاہرہ جزء اول ص ۳۲۶

فاتحہ کے بعد سورہ کافرون اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھنی چاہئے۔ باقی دو رکعتیں جن کی تعلیم شیخ فریدالدینؒ نے بعد میں دی تھی انھیں 'استحباب' کہتے ہیں۔ ان میں پہلی رکعت میں سورہ واقعہ اور دوسری میں سبح اسم پڑھنی چاہئے[1] اس کے بعد نماز تسبیح ادا کرے۔ اس میں ہر رکعت میں یہ دعا پڑھنی چاہئے: سبحان اللہ ملاء المیزان ومنتھی العلم ومبلغ الرضا وزنۃ العرش[2]

'نماز تسبیح' ہی کی طرح ایک اور نماز 'صلوٰۃ الصلوات' ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں تسبیح کے بجائے درود پڑھتے ہیں۔ یہ نماز دو رکعت ہوتی ہے اور شب و روز میں کسی وقت بھی پڑھی جاسکتی ہے لیکن اشراق کے بعد یہ زیادہ موثر ہے اور جس ضرورت کے لئے بھی اسے پڑھا جائے وہ پوری ہو جائے گی۔ اگر کسی ضرورت کے لئے اسے تین جمعہ متواتر اشراق کے بعد پڑھا جائے تو وہ ضرورت پوری ہوگی[3]

اسی طرح دو رکعت شکر روز اور دو رکعت شکر شب کی ادا کی جاتی ہے شکر روز کی دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے بعد پانچ بار قل ھو اللہ احد پڑھنا چاہئے[4] اور شکر شب کی دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے بعد پانچ بار قل یا ایہا الکافرون پڑھنا چاہئے[5] چاشت

۱؎ فوائد الفواد، ص۵۸، سیر الاولیا ص۸۶-۳۸۷ ۲؎ سیر الاولیاء ص۳۸۸

۳؎ مختلف مہینوں کے فضائل اور ان سے متعلق نمازوں کے سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ان نمازوں کے سلسلہ میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں ان میں سب سے بہتر صلوٰۃ التسبیح کی حدیث ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ اس کے باوجود ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ امام احمدؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اصول حدیث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سب حدیثیں موضوع ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام جلد ۱۱، ص۵۷۹-۵۷۸

۴؎ سیر الاولیاء، ص۳۸۸ ۵؎ سیر الاولیاء ص۸۹-۳۸۸، فوائد الفواد ص۸۷

کے وقت بارہ رکعت نماز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یوں اس کی کم سے کم مقدار چار رکعت ہے۔ یہ نماز چار چار رکعت میں پڑھی جائے گی اور ان میں سے ہر چار رکعت کے لئے الگ الگ سورتوں کی تعیین کی گئی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے پہلی چار رکعتوں میں انّا فتحنا، انّا ارسلنا، انّا انزلنا، اور انّا اعطینا پڑھنا چاہئے۔ درمیانی چار رکعتوں میں والشمس، واللیل، والضحی اور الم نشرح پڑھنا چاہئے۔ آخری چار رکعتوں میں چاروں قل پڑھنا چاہئے۔ چاشت کے وقت دو رکعت نماز صحت النفس کی پڑھی جاتی ہے۔ پہلی رکعت میں آیۃ الکرسی اور سورہ والشمس ایک ایک بار اور سورہ اخلاص پانچ بار نیز دوسری رکعت میں آمن الرسول اور والضحی ایک ایک بار اور سورہ اخلاص پانچ بار پڑھنا چاہئے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے اللھم انی اسألک العفو والعافیہ والمعافاۃ فی الدنیا والآخرۃ[1]

زوال کے بعد چار رکعت فی الزوال کی پڑھی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پچاس[۱] یا دس[۲] بار یا تین[۳] بار سورہ اخلاص پڑھنا چاہئے[2] نماز ظہر کے بعد صلوۃ الخضر ادا کی جاتی ہے۔ یہ کل دس رکعت ہوتی ہیں اور دو دو رکعت میں ادا کی جاتی ہیں اور ان میں قرآن کریم کی آخری دس سورتیں پڑھی جاتی ہیں[3] اس نماز کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں۔

تحقیق انیست کہ ایں نماز حضرت خضر است	تحقیق یہ ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام
علیہ السلام تا ہر کہ ایں نماز پیوستہ بگزارد	کی نماز ہے اور جو بھی یہ نماز پابندی سے ادا
با خضر علیہ السلام ملاقی شود۔[4]	کرتا رہے گا اسکی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوگی۔

---

[1] سیر الاولیاء صد ۳۸۹ [2] سیر الاولیاء صد ۳۹ ۔ زوال کے بعد چار رکعت نماز سنت سے ثابت ہے لیکن ان کی یہ کیفیت ثابت نہیں ملاحظہ کیجئے زاد المعاد، حصہ اول صد ۹۷ [3] فوائد الفواد صد ۳۲ خیر المجالس صد ۲۱۷، سیر الاولیاء صد ۳۹ [4] فوائد الفواد صد ۳۲

فوائد الفواد میں ایک جگہ اودش کی ایک ویران مسجد کا تذکرہ ہے جس کے ایک منارے کو ہفت منارہ کہتے تھے۔ جو کوئی اس مسجد میں ایک مخصوص دوگانہ ادا کرتا تھا اور ایک دعا پڑھتا تھا جس کو ہفت دعا کہتے تھے، اس کی ملاقات حضرت خضر سے ہوتی تھی چنانچہ اسی طور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے حضرت خضر سے شرف ملاقات حاصل کیا[1]

نماز مغرب کے بعد بیس رکعت نماز اوابین پڑھنی چاہئے۔ بعد نماز سر بسجود ہو کر یہ دعا پڑھنی چاہئے" اللھم ارزقنی توبۃ توجب محبتک فی قلبی یا محب التوابین[2] اس کے علاوہ مغرب اور عشاء کے درمیان چھ رکعت اور نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے[3] مغرب کے بعد ہی دو رکعت نماز ایمان کی نگاہ داشت کے لئے پڑھی جاتی ہے پہلی رکعت میں سورہ اخلاص آٹھ بار اور سورہ فلق ایک بار نیز دوسری رکعت میں سورہ اخلاص سات بار اور سورہ ناس ایک بار پڑھی جاتی ہے۔ نماز سے فراغت کے

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۱۳-۲۱۲ [2] سیر الاولیا، ص ۳۹۱۔ اس نماز کے بارے میں یہ حدیث معروف ہے من صلی بین المغرب والعشاء عشرین رکعۃ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ ۔ ابن ماجہ (۱/۲۱۴) اور ابن شاہین نے 'الترغیب والترہیب' (۱/۱۷۲، ۲۷۷، ۲۷۸) میں اس کی روایت کی ہے۔ دور حاضر کے شہرہ آفاق محدث شیخ محمد ناصر الدین البانی اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔ عشاء اور مغرب کے درمیان متعین رکعات کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ جن احادیث میں اس وقت میں متعین طور پر نماز کی رکعات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز ثابت ہے البتہ رکعات کا تعین ثابت نہیں ہے۔ یہی صورت حال بعد مغرب چھ رکعتوں کے سلسلہ میں بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے شیخ محمد ناصر الدین البانی، سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ واثرہا السیئ فی الامۃ، المکتب الاسلامی، بیروت، دمشق، المجلد الاول ص ۴۸۰،
۴۸۲ [3] ایضاً نیز فوائد الفواد ص ۲۰۷

بعد سر بسجدہ ہو کر یہ دعا پڑھی جاتی ہے **یا حیّ یا قیوم ثبتنی علی الایمان**[۱]
اسی طرح مغرب کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے جسے صلوٰۃ البروج کہتے ہیں۔
پہلی رکعت میں والسماء ذات البروج اور دوسری رکعت میں والسماء والطارق پڑھی
جاتی ہے۔ صلوٰۃ البروج کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیئے **اللھم انی استودعك
ایمانی ودینی فاحفظھما**[۲] مغرب کے بعد ہی دو رکعت صلوٰۃ النور پڑھی
جاتی ہے[۳] دونوں ہی رکعتوں میں سورہ انعام کی ابتدائی آیتیں یستھزؤن تک پڑھنا
چاہیئے۔ یہ دونوں نمازیں اوابین کی بیس رکعتوں میں شامل ہیں۔ مشائخ چشت کے نزدیک
احیاء بین العشائین سنت موکدہ ہے اور اس وقت کو صوفیہ کی اصطلاح میں صبح عاشقاں
کہتے ہیں۔[۴]

عشاء کے بعد جن نمازوں کی تاکید کی جاتی ہے ان میں ایک صلوٰۃ السعادت
ہے۔ یہ نماز چار رکعت ہوتی ہے۔ پہلی رکعت میں سورہ اخلاص ۱۰ بار، دوسری میں ۲۰
بار، تیسری میں ۳۰ بار اور چوتھی میں ۴۰ بار پڑھنا چاہیئے[۵] بعد عشاء دو رکعت نماز
آنکھوں کی روشنی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد ۷ بار سورہ کوثر پڑھنا
چاہیئے اور نماز کے بعد یہ دعا کرنا چاہیئے **اللھم متعنی بسمعی وبصری
واجعلھما الوارث منی**[۶] اس کے بعد چار رکعت صلوٰۃ العاشقین پڑھی جاتی
ہے۔ پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد ۱۰۰ مرتبہ یا اللہ، دوسری رکعت میں ۱۰۰ مرتبہ یا رحمٰن،
تیسری میں ۱۰۰ مرتبہ یا رحیم اور چوتھی میں ۱۰۰ مرتبہ یا ودود پڑھنا چاہیئے[۷] اسی طرح صلوٰۃ
القربت، ادا کی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد ۷۰ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھنا
چاہیئے اور نماز سے فراغت کے بعد ۷۰ بار استغفر اللہ کہے اور پھر یہ دعا پڑھے

---

۱ سیر الاولیاء صہ ۳۹۱ ۲ فوائد الفواد صہ ۷۷-۷۸، سیر الاولیاء صہ ۱۹۲، ۳۹۱ ۳ سیر الاولیاء
صہ ۳۹۲ ۴ سیر الاولیاء صہ ۳۹۲ ۵ سیر الاولیاء صہ ۳۹۲-۳۹۳ ۶ سیر الاولیاء صہ ۳۹۳
۷ سیر الاولیاء صہ ۳۹۳

اللھم ارزقنی العمل الذی یقربنی الیک[1] اسی طرح نماز صبح سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے پہلی رکعت میں سات بار فاتحہ اور ایک بار سورہ کافرون اور دوسری رکعت میں سات بار فاتحہ اور ایک بار سورہ اخلاص، سلام کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن اشھد ان اللہ احاط بکل شیء علماً واحصی کل شیء عدداً، دس بار استغفار، دس بار یا حی یا قیوم یا ذا الجلال والاکرام کہے اور پھر سر برہنہ کرے، ہاتھوں کو اوپر اٹھائے اور کہے یا ارحم الراحمین، پھر سجدہ ریز ہو کر دس بار اغثنا یا غیاث المستغیثین کہے۔ پھر جس کام کو بھی کرے پورا ہوگا[2]

رجب کے پہلے جمعہ کی شب میں ایک نماز پڑھی جاتی ہے جسے نماز لیلۃ الرغائب کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیاء فرماتے تھے کہ جو یہ نماز پڑھے گا اس کی موت اس سال میں نہ ہوگی[3] وہ خود یہ نماز با جماعت ادا کرتے تھے[4] نیز سفر میں نکلتے وقت دو رکعت نماز محافظت نفس کے لئے پڑھی جاتی ہے[5]

اس کے علاوہ مختلف اوقات کی سنتوں میں اور بعض دوسری نمازوں میں مخصوص سورتوں کی تعیین کا مسئلہ ہے[6] اس میں شبہ نہیں کہ بعض نمازوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض سورتیں نسبتاً زیادہ اور کثرت سے پڑھتے تھے[7] لیکن مخصوص نمازوں میں مخصوص سورتوں کی تخصیص اور مواظبت سنت سے ثابت نہیں ہے سوائے جمعہ اور عیدین کے[8]

اس بحث کو ہم حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی ایک عبارت پر ختم کرتے ہیں جس سے زیر نظر مسئلہ کی اہمیت اور سنگینی کا احساس پوری طرح اجاگر ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۹۳ [2] سیر الاولیاء ص ۳۹۵، ۳۹۶

[3] فوائد الفواد، ص ۳۷، سیر الاولیاء، ص ۳۹۷، ۳۹۸ [4] سیر الاولیاء ص ۳۹۸

[5] فوائد الفواد، ص ۱۵۰-۱۵۱ [6] مثال کے طور پر دیکھئے فوائد الفواد ص ۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۲، سیر الاولیاء ص ۳۹۰، ۳۹۲-۳۹۷ [7] ملاحظہ کیجئے زاد المعاد جلد اول ص ۵۳-۵۴، ۸۷-۸۸ [8] زاد المعاد جلد اول ص ۱۱۶

اقتباس کسی قدر طویل ہے اس لئے ہم اس کے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"بدعت نام ہے دین میں کسی ایسی چیز کے داخل کرنے کا جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے نہ تو اس کے اندر داخل کیا ہو اور نہ اس کا حکم دیا ہو، اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ دین کا جزء ہے اور شرعی احکام کی طرح اس کی نام نہاد شرائط اور آداب کی پابندی کرتے ہوئے اسے بغرض ثواب کیا جائے۔ بدعت اللہؐ کی نازل کردہ شریعت کے متوازی ایک من گھڑت شریعت ہے۔ اس کی اپنی مستقل فقہ ہے، اپنے فرائض، واجبات، سنت اور مندوبات ہیں جو کبھی تو شریعت الٰہیہ کے بالمقابل آکھڑے ہوتے ہیں اور کبھی اہمیت اور عظمت میں اس پر بھی فوقیت لے جاتے ہیں۔

بدعت اس واضح حقیقت سے آنکھیں میچ لیتی ہے کہ دین مکمل ہو چکا اور شریعت پر مہر ثبت ہو چکی، جن چیزوں کو مقرر ہونا تھا وہ مقرر ہو چکیں، جو فرائض و واجبات متعین ہونے تھے وہ ہو چکے اور دین کی ٹکسال، بند ہو چکی۔ اب جو بھی نیا عمل اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ محض غلط اور کھوٹا ہوگا۔ حضرت امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا ہے "جس نے بھی دین کے اندر کوئی نئی چیز ایجاد کی اور اسے اچھا سمجھا تو گویا اس کا خیال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگی رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں نے آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا"[1] جو اس وقت دین کا جزء نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتا۔"[2]

یہ نمازیں، ان کے نام، ان کے آداب و شرائط، ان کے ایام اور اوقات ان کے اندر پڑھی جانے والی سورتیں اور دعائیں، ان کے اثرات اور نتائج یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی اصل کتاب و سنت میں نہیں پائی جاتی۔ یہ چیزیں چاہے جتنی بھی نیک نیتی سے دین کے اندر داخل کی گئی ہوں اور ان کو داخل کرنے والی چاہے کتنی ہی برگزیدہ ہستیاں رہی ہوں، بہر حال ابتداع اور اضافہ کے ہی زمرہ میں آئیں گی۔ حصول رضا خداوندی کا طریقہ صرف وہی ہے جو اس کے رسولؐ کی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی جہاں کہیں بھی ہے ناقابل قبول ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے "من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد"[3]

---

[1] سورہ مائدہ ۳۔ [2] مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، العقیدہ والسلوک فی ضوء الکتاب والسنۃ والسیرۃ النبوۃ المجمع الاسلامی العلمی، لکھنؤ ۱۹۸۱ء صفحہ ۹۱، ۹۲ [3] متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

المسجد الاقصیٰ

اور اس کے ماحول کی قدیم تاریخ

(۲)

جناب عبدالباری ایم۔اے

مسجد اقصیٰ

رحمۃ للعالمین جلد دوم (ص ۱۲۷ تا ص ۱۲۹) میں صحیح مسلم کی حدیث عن انسؓ بیان ہوئی ہے "میں سواری پر سوار ہوا اور بیت المقدس پہونچا۔ سواری کو اسی حلقہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ مسجد میں جاکر میں نے دو رکعت نماز ادا کی اور وہاں سے آسمان کی طرف عروج ہوا" ـــــ اس حدیث کی رُو سے اس وقت وہاں 'مسجد' موجود تھی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد 'وہاں' سے عروج ہوا۔

قارئین مبلغ ٹامسن کا بیانِ سفر پڑھ چکے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی مغربی گوشہ سے وہ روانہ ہوا اور جنوب کی طرف چلا۔ پہلے کچھ دور چلنے کے بعد مسجدِ عمر کا مقام آیا تو مُرگو جوتے پہنے۔ اور پہنے ہوئے آگے بڑھا یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ سے بھی گذر گیا۔ سطح کے متعلق اُس نے بیان کیا کہ ہموار نہیں ہے بلکہ مسجد عمر سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف ڈھلوان ہے ـــــ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسجد عمر ایک جگہ تھی اور مسجد اقصیٰ کا مقام ذرا ہٹ کر ہے۔

فرانسیسی مؤرخ سینوبس (Seignobos) (تاریخ اقوام و ملل قدیمہ) نے 'معبد یروشلم' ہی کو 'مسجد اقصیٰ' قرار دیا ہے۔

'رابطہ العالم الاسلامی' جون ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں 'مسجد اقصیٰ' کے بارے میں اس طرح درج ہے کہ "یہ جنوب کی سمت واقع ہے اور تاریخ میں مذکور ہے کہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان

نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ اور اس کے بعد کے خلفاء بھی اس پر توجہ دیتے رہے۔ اور مسجد اقصیٰ کے زلزلے سے متاثر ہونے کے بعد جب ۱۵۸ھ میں عباسی خلیفہ سے دیکھنے گیا تو اس نے اس کی تعمیر کا حکم دیا ــ اور فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کا معاصر مؤرخ مقدسی کہتا ہے کہ یہ مسجد مدینۃ القدس (یعنی یروشلم) کے جنوب مشرقی رکن میں واقع ہے۔ ناصری خسرو مسجد کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ اس میں ۲۸۰ کھمبے اور ۱۴ سائبان ہیں اور مسجد کا طول شمال سے جنوب تک ۱۲۰ گز (۳۶۰ فیٹ) ہے اور اس کا عرض شمال فصیل کی طرف ۱۵۰ گز (یعنی ۴۵۰ فیٹ) ہے۔ اور یہ مسجد کی خوش نصیبی ہے کہ یہ ہر دور میں مسلمانوں کے احترام و زیارت و نماز کا مرکز رہی ہے۔"

تحویل قبلہ کے بعد سے جو مسجد بھی یروشلم میں بنائی گئی اس کا رخ یعنی قبلہ کعبۂ مکہ کی طرف رکھا گیا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد نمبر ۱۵ میں صفحہ ۶۹۰ پر مسجد اقصیٰ (۱۸۷۰ء میں) کی ایک عمدہ تصویر شکل نمبر ۹ دی ہوئی ہے جس میں داخلہ کا صدر دروازہ شمال کی جانب ہے اور گنبد (امام کی جگہ) جنوب کی طرف نظر آرہا ہے۔ ایک علیحدہ سے دوسری تصویر اسی مسجد اقصیٰ کو رُوکار (Frout Elevation) ہے جس سے صدر داخلہ کی تفصیلات اس کی چھت کی ڈھلوانی شکل اور آخری جنوبی حصہ کا گنبد بھی پشت میں نظر آتا ہے۔ پھر جلد نمبر ۱۶ کے صفحہ ۶۹۰ پر اس مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے متعلق درج ہے کہ "تقریباً ۱۶۱ھ میں بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کو خلیفہ المہدی نے جزوی طور پر دوبارہ تعمیر کیا اس وقت اس عمارت میں ایک وسطی دالان (ذرا اونچی چھت کے ساتھ) ۱۱½ میٹر عریض تھا۔ اور اس کے ساتھ ۷ قطاریں (دالان کی) دائیں طرف اور ۷ بائیں جانب موجود تھیں۔ جن میں ہر ایک کا عرض ۶¼ میٹر تھا۔ یہ سب کوہانی چھتوں سے مسقف تھیں (یعنی اونٹ کے کوہان کی شکل کی ۔۔۔) اور تمام دیواریں قبلہ سے عموداً واقع تھیں۔ مرکزی دالان کے آخری سرے پر ایک بڑا چوبی گنبد تھا۔ شمال ضلع میں ایک بڑا وسطی دروازہ تھا۔ دائیں اور بائیں سات سات چھوٹے دروازے

اور مشرقی ضلع میں چھ غیر مزین دروازے بھی تھے" (لیکن تصویر میں تو مشرق کی طرف ۱۱ دروازے نظر آتے ہیں!)

فنی اعتبار سے قرطبہ کی جامع مسجد پر (جسے عبدالرحمٰن اول نے ۱۷۰ھ/۷۸۶ء میں تعمیر کی تھی) اس مسجد کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ اب تک موجود و محفوظ ہے۔ بیت المقدس کی طرح اس میں ۱۱ دالان (۵ داہنی طرف ۵ بائیں طرف وسط میں صدر دالان) عقبی دیوار کے ساتھ عمود اُبنے ہیں۔ ان سب پر متوازی ڈھلوان چھتیں ہیں اور مرکزی چھت دوسروں سے زیادہ چوڑی (اور اونچی) ہے۔

یہی اسٹائل دمشق کی جامع کبیر میں بھی پائی جاتی ہے۔ صحن۔ ایوان قبلہ، محرابیں ستون وغیرہ اور کوہانی چھتیں سب یکساں نظر آتی ہیں۔ البتہ جامع کبیر کی تعمیر بہتر معلوم ہوتی ہے۔

عابد اللہ غازی صاحب اور ان کی اہلیہ نے امریکن نرسری اسکولوں کے لئے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ قدس (یعنی یروشلم) میں مسجد اقصیٰ پہلے داؤدؑ نے بنائی پھر ان کے بیٹے سلیمانؑ نے مکمل کی جسے رومیوں نے برباد کر دی۔ آنحضرؐ نے مسجد کے مقام پر نماز ادا کی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ براق جب آنحضرتؐ کو معراج سے واپس لایا تو تمام انبیاءؑ انتظار کر رہے تھے۔ اور آپؐ نے نماز پڑھائی!

رحمۃ للعالمین جلد اول میں ابن ابی حاتم کی ایک روایت عن یزید بن ابی مالک عن انس میں نماز بیت المقدس کے متعلق یہ صراحت ہے کہ "میرے پہونچ جانے کے بعد وہاں بہت سے لوگ جمع ہوگئے اذان دی گئی اور اقامت کہی گئی۔ صفیں درست ہوئیں۔ ہم انتظار میں تھا کہ نماز کون پڑھائے گا؟ جبرئیل نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آگے کھڑا کر دیا۔ بعد ازاں نماز جبرئیل نے پوچھا: آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پیچھے کن لوگوں نے نماز پڑھی ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ جبرئیل نے کہا یہ سب وہ انبیاءؑ ہیں جو منجانب اللہ مبعوث ہو چکے۔"

صخرہ (The Roch)

اس صخرہ کے متعلق مبلغ ٹامسن کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

لاہور، جلد نمبر ۱۶ (۱) کے ص ۲۳۹ پر مندرجہ بیان بھی ملاحظہ ہو "صخرہ ۵۶ فیٹ لمبا، ۴۲ فیٹ چوڑا اور تقریباً نصف دائرہ شکل ہے۔ اس کا منحنی ڈھلوانی پہلو مشرق کی جانب ہے اور سیدھا اونچا بلند تر پہلو مغرب کی سمت، علم طبقات الارض (یعنی (Geology)) کے اعتبار سے یہ چٹان یروشلم کی سطح مرتفع کی زیادہ سخت قسم کی سرمئی رنگ کی چٹانوں کا حصہ ہے۔ اور عملاً اپنی غیر تراشیدہ شکل ہی میں قرنہا قرن سے چھوڑ دیا گیا ہے"۔ (کاش ایسے ہی صفا و مروہ کی پہاڑیاں بھی اپنی اصلی حالت میں رہ جاتیں!)

عابد الغازی صاحب کی انگریزی کتاب میں ایک تصویر بناکر دکھایا گیا ہے کہ اسی چٹان سے رسول اللہ صلعم آسمان پر تشریف لے گئے! اسی لئے اس چٹان کی اہمیت تاریخ اسلام میں ہے!

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد نمبر ۱۶ (۱) قبۃ الصخرۃ کے عنوان کے تحت درج ہے کہ "ابن الاثیر کی روایت کے مطابق فرنگیوں نے صخرہ پر سنگ مرمر چڑھا دیا، کیونکہ عہد قدیم کے عیسائی پادری صخرہ کے اجزا و برکت کی خاطر زائرین کے ہاتھوں ہم وزن سونے کے عوض بیچتے تھے۔ اور بادشاہوں کو خطرہ ہوا کہ اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو صخرہ معدوم ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے صخرہ پر سنگ مرمر کی سلیں چڑھا دیں"۔

"عوام الناس میں صخرہ کے بارے میں جو روایات مروج ہیں مثلاً یہ کہ صخرہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے، یا صخرہ جنت کی چٹانوں میں سے کوئی چٹان ہے، اور یہیں کھڑے ہو کر قیامت کے دن اسرافیل صور پھونکیں گے، ان کی کوئی شرعی اور اسلامی حیثیت نہیں ہے۔ ابن تیمیہ، البقاعی، السیوطی، شہاب الدین احمد بن حجر، ابن القیم اور امام احمد العجمی المصری نے ان کو بے بنیاد قرار دیا ہے"۔ (بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد نمبر ۱۶ (۱) ۔ عارف العارف: تاریخ قبۃ الصخرۃ المشرفۃ ص ۲۳۳)

لیکن اسی جلد نمبر ۱۶ (۱) میں ایک نقشہ تعمیر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "نیچے کے غار میں جانے کے لئے صخرہ سے مشرق میں "باب المغارۃ" نامی ایک دروازہ ہے، ۱۱

سیڑھیاں اترنے کے لئے ہیں۔ غار کی بلندی اوسطاً ۶ فیٹ ہے۔ اس کا فرش سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے اس میں ۱۶۳ آدمی سما سکتے ہیں۔ غار کے اندر سنگِ مرمر کے دو ستونوں پر دو محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ دائیں محراب کے سامنے مقام خضرؑ ہے اور شمال کونے میں ایک چبوترا ہے جسے مقام الخلیل کہا جاتا ہے۔ صخرہ کے جنوب مشرق میں ایک زینہ ہے وہاں سے ہم اُس ہلال تک پہونچ سکتے ہیں جو (صخرہ کے) قبّے کے کلس پر لگا ہوا ہے"۔ غالباً اسی اصل سے مندرجہ بالا بے بنیاد روایات مروج ہوگئی ہیں! قبّہ بن جانے کے بعد سے تو 'صخرہ' ایک کھلا چٹان عمارت کے اندر صحن میں آگیا ہے۔

'رابطہ العالمی الاسلامی' جون ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں ص۵۰-۵۱ پر بیان ہوا ہے کہ:

"مذکورہ 'صخرہ' شہر کے مرتفعات میں سے ایک چٹان ہے جو تقریباً غیر مسطح اور ناہموار ہے جس کی لمبائی ایک مخصوص جائزہ کے مطابق تقریباً ۵۶ قدم اور عرض تقریباً ۴۲ قدم ہے۔ اس کا مشرقی کنارہ نشیب کی سمت ہے۔ اور مغربی کنارہ راست جانب جھکا ہوا ہے۔ اور یہ چٹان تقریباً ایک میٹر سطح زمین سے بلند ہے اور اس کا رقبہ تقریباً ۱۰ مربع میٹر ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ یہ چٹان آسمان و زمین کے درمیان معلق ہے!! اور اس کے نیچے ایک کشادہ جگہ ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ 'کہف' کا بقیہ حصہ ہے جسکی گہرائی نصف میٹر یا ایک میٹر سے زائد ہے۔ 'کہف' کی زمین اور چٹان کے درمیان لکڑی کا ایک ستون ہے! جب حضرت عمرؓ نے قدس (یروشلم) کو فتح کیا تو اس چٹان پر (جس پر چڑھ کر نبیؐ آسمان کی طرف تشریف لے گئے تھے) ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور میں وہ قبہ تعمیر کیا گیا جو آج 'قبۃ الصخرۃ' کے نام سے معروف و مشہور ہے"۔ اس بیان میں صخرہ کے سائز میں 'قدم' سے نشاندہی کی گئی ہے اور مبلغ تامسن کے بیان میں 'فیٹ' سے؟ یہاں رقبہ بتلانے میں شاید بھول ہوئی ہے؟ بہت ہی کم معلوم ہوتا ہے؟

قبۃ الصخرہ کی ہئیت (Dome of the Roch—Its shape)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد نمبر ۱۶ کے صفحات ۶۸۱، ۶۸۷ میں درج ہے کہ "بیت المقدس کا قبۃ الصخرہ جو آج مسلم فن تعمیر کی قدیم ترین یادگار ہے، خلیفہ عبدالملک نے تعمیر کیا اور یہ ۷۲ھ (۶۹۱ء) میں تکمیل کو پہونچا۔ اس حلقہ نما عمارت کی سیدھی سادی تفصیل یہ ہے: ایک چوبی گنبد، جس کا قطر (Diam.) ۲۰٫۴۴ میٹر ہے۔ ایک بڑے ڈھولے کے اوپر قائم کیا ہے۔ جس میں ۱۶ دریچے بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ چار پیل پایوں اور ۱۲ استونوں پر کھڑا ہے جو دائرے کی صورت میں بنائے گئے ہیں۔ اور ان کی ترتیب یوں ہے کہ ہر تین ستونوں کے بعد ایک پیل پایہ ہے۔ ستون اور پایوں کا یہ دائرہ ایک بڑے مثمن (Octagon) کے وسط میں ہے۔ مثمن کا ہر ضلع (Side) اوسطاً ۲۰٫۶۰ میٹر ہے۔ ضلعوں کی آٹھ دیواریں ساڑھے نو نو میٹر اونچی ہیں (منڈیر اس کے علاوہ ہے، جس سے ۲٫۶۰ میٹر کا اضافہ ہو جاتا ہے) ان سب دیواروں کے بالائی نصف حصے میں پانچ پانچ دریچے بنائے ہیں، ان چار اضلاع میں جو اصلی چار سمتوں کے بالمقابل ہیں، ایک ایک دروازہ ۲٫۶۰ میٹر عریض اور ۴٫۳۰ میٹر بلند بنایا گیا ہے۔ جس سے ان اضلاع میں دروازے کے اوپر کا وسطی دریچہ بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ چونکہ دائرے اور اس کے گرد مثمن کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ اور اکہرے شہتیروں سے بآسانی نہیں پاٹا جا سکتا تھا۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان ایک اور مثمن بنایا گیا جس کی محرابیں آٹھ پیل پایوں اور سولہ ستونوں پر کھڑی ہیں۔ اس ترتیب سے ہر دو ستونوں کے بعد ایک پیل پایہ بنا دیا گیا ہے تاکہ چھت کو ضروری سہارا مہیا ہو جائے۔ اس طریقے سے مرکز کے گرد دو دائرے بن گئے ہیں — جو ظاہر ہے کہ قبۃ الصخرہ کے گرد رسمی طواف کا کام دیتے ہیں۔ بیرونی مطاف کی چھت غالباً سلطان الناصر محمد نے ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء میں تعمیر کی اور اندرونی مطاف کی چھت کی تاریخ بظاہر اٹھارویں صدی کے اواخر میں متعین کی جا سکتی ہے۔ اصل پہلا گنبد (جو ۴۰۷ھ / ۱۰۱۶-۱۰۱۷ء میں گر

گیا تھا) سیسے کی چادروں سے ڈھکا ہوا تھا جن کے اوپر صیقل شدہ پیتل کی ۲۱۰ و ۱۰ تختیاں جڑ دی گئیں۔ قبۃ الصخرہ اپنے اجزاء کی موزونیت اور پُر مایہ تزئین کے باعث دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔"

اسی انسائیکلو پیڈیا کی جلد نمبر ۱۶ (۱) میں دوسرے مضمون نگار کا بیان بھی ملاحظہ ہو: "قبۃ الصخرہ کی پوری عمارت کچھ دوسری چھوٹی عمارتوں کے ساتھ وسط حرم میں ایک ناہموار چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا کل رقبہ (area) قبلہ سے شمال کی جانب ۲۲۹ ہاتھ (یعنی ۶۸۰ فیٹ) اور مشرق سے مغرب کی جانب ۲۲۳½ ہاتھ (یعنی ۶۷۰ فیٹ) ہے۔ فرش پر مرمر کی سلیں بچھی ہوئی ہیں جو ۱۸۷۲ء میں سلطان عبدالعزیز کے زمانہ میں لگائی گئی تھیں۔ اس کا بلند ترین نقطہ چبوترے سے صرف ۵ فیٹ اونچا ہے۔ چبوترے کے اوپر تک پہونچنے کے لئے ۹ سیڑھیاں ہیں۔ (جن میں سے ۸ سیڑھیاں ایسی ہیں کہ جب وہ صحن مسجد کے چبوترے تک پہونچ جاتی ہیں تو وہاں محراب دار ستون بنے ہوئے ہیں)۔

"عمارت مثمن الاضلاع (Octagonal) شکل میں ہے جس کا ہر ضلع یا پہلو (Side) ۶۶ فیٹ لمبا ہے۔ اندرونی قطر (Diam) ۱۹۲ فیٹ ہے۔ اور قبے کے قاعدے (کرسی (Plinth)) کا قطر ۶۶ فیٹ۔ یہ قبہ ۹۹ فیٹ بلند اور لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر باہر کی طرف سیسہ چڑھایا گیا ہے اور اندر کی طرف گچ کا استر کیا گیا ہے جس میں خوبصورت سنہری کام اور آرائش کی گئی ہے۔ بیرونی ہشت پہلو دالان ۱۳ فیٹ چوڑا ہے اور اندرونی ۳۰ فیٹ۔ دروازے ۴، اہم کونوں کے سامنے ہیں ـ (۱) شمالی دروازے کو 'باب الجنۃ' کہتے ہیں، جنوبی کو 'باب القبلہ'، مشرقی کو 'باب النبی داؤد' (اسی کو 'باب السلسلہ' بھی کہتے ہیں) اور مغربی کو 'باب الغرب'۔

"عمارت کی زیریں منزل ۱۶ فیٹ بلند ہے اور اسی میں مذکورہ بالا دروازے ہیں۔ اس پر سادہ چنائی کی ۲۰ فٹ بلند بالائی منزل ہے۔ پھر سب کے بعد وہ حیرت انگیز بالائی قبہ ہے اور قبہ کے کلس پر ہلال لگا ہوا ہے۔

قبۃ الصخرہ کا معمار کون؟

"اکثر روایات کے مطابق صخرہ کے اوپر قبّے کی تعمیر کا شرف پانچویں اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان (۶۶ھ/۶۸۸ء تا ۷۲ھ/۶۹۱ء) کو حاصل ہوا۔ اس قبۃ کی تعمیر کا محرک بیان کرتے ہوئے مورخین نے دو قسم کی رائیں بیان کی ہیں۔ (i) الیعقوبی لکھتا ہے: تعمیر قبہ کے محرک اس وقت کے سیاسی حالات تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے امویوں کے خلاف بغاوت کردی تھی اور حجاز کے استقلال کا اعلان کر رکھا تھا۔ لہٰذا عبدالملک کو یہ خوف لاحق ہوا کہ اہل شام و فلسطین جب حج کے لئے جائیں گے تو عبداللہ بن زبیرؓ ان سے اپنی بیعت لے لیں گے۔ چنانچہ اس نے مسجد صخرہ کی تعمیر کرائی اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بیت المقدس کا حج کریں اور صخرہ کا طواف کریں (ii) اس کے برعکس المقدسی کا بیان ہے (جس نے ۳۷۴ھ/۹۸۴ء میں بیت المقدس میں قیام کیا تھا) کہ عبدالملک نے جب کنیسۃ القیامۃ کا قبہ دیکھا جس کا عیسائی رعایا حج کرتی تھی تو اس کو خدشہ ہوا کہ اس کی شان و شوکت دیکھ کر مسلمان متاثر ہوں گے تو اس نے عزم مصمم کرلیا کہ وہ ایسی ہی یا اس سے پرشکوہ مسجد بنائے گا۔ چنانچہ اس نے مسجد صخرہ بنائی اور اس پر قبہ تعمیر کیا (احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص۱۵۹)۔ عبدالملک نے آغازِ تعمیر سے پہلے اپنے عاملوں کو خطوط لکھے جواب میں ردّعمل کا ایک پہلو یہ رہا کہ مسلمانوں میں غیض و غضب کی لہر دوڑ گئی کہ آپ ہمیں بیت اللہ کے حج سے روک رہے ہیں جو اللہ کا عائد کردہ فرض ہے؛ انھیں عبد الملک نے یہ حدیث سنائی کہ "تین مساجد کی طرف سفر کیا جاسکتا ہے یعنی مسجد حرام، میری مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصٰی"۔ دوسرا پہلو یہ آیا کہ لوگوں کی طرف سے پرجوش پذیرائی ہوئی تو خلیفہ نے القدس کی تزئین و آرائش کا کام شروع کیا (تاریخ الخلفاء المسلمین ص۹۲) اور اس کے بعد اپنی رعایا کے سامنے اعلان کیا: "یہ صخرہ آئندہ کعبہ کی جگہ تمہارا قبلہ ہوگا" (الیعقوبی ۲: ۳۱۱)

"صخرہ پر قبے کی تعمیر سے پیشتر عبدالملک نے تقریب ہی مشرقی نمونے کے طور پر ایک قبہ بنوایا (جسے قبہ السلسلہ کہا جاتا ہے) اور پھر اس کے مطابق قبہ الصخرہ تعمیر کیا (عارف العارف: تاریخ القبۃ المشرفۃ ص۶۷) صخرہ کے چاروں طرف آبنوس کی جالی دار دیوار بنائی گئی اور زربفت کے پردے لٹکائے گئے۔ اس زمانہ میں مشک و عنبر میں بسا ہوا بخور اتنا سلگایا جاتا کہ جو شخص بھی جاکر وہاں سے باہر نکلتا تو وہ اپنے کپڑوں کی خوشبو سے پہچان لیا جاتا تھا کہ وہاں سے آیا ہے۔

"ایک مدت سے یہ مسئلہ معرض بحث ہے کہ قبہ الصخرہ کا اصل بانی اور معمار کون ہے؟ عبدالملک بن مروان یا اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک؟ تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تعمیر کا آغاز و اتمام تو عبدالملک کے ہاتھوں ہی ہوا ہے البتہ ولید بحیثیت ولی عہد اس میں شریک رہا ہے۔ اور بعض نقش و نگار تو اسی کے عہد میں کئے گئے۔ فرگوسن (ferguson) نے تعمیر کے متعلق دوسری رائے دی ہے لیکن بہت سے مغربی محققین ہی نے اس کی رائے کو مغالطہ آمیز اور گمراہ کن کہہ دیا! صحیح بات وہ معلوم ہوتی ہے جو البلاذری نے لکھی ہے: "ولید نے شاہِ روم کو اپنے ارادے سے مطلع کیا کہ میں قبۃ الصخرہ کو مزین کرنا چاہتا ہوں اور لکھا کہ وہ فُسیفسا (Mosaic chips) جتنا بھیج سکے بھیجے۔ شاہِ روم نے اس کا مطالبہ پورا کیا" (البلاذری: فتوح البلدان) الطبری نے نصف صدی بعد اس روایت کی تائید کی ہے۔ (عارف العارف: تاریخ القبۃ المشرفۃ ص۱۳۶)

"یہ بات کہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر عبدالملک نے کی تھی اس مشہور کتبہ سے ظاہر ہوتی ہے جو (جنوب مشرقی جانب درمیانی حصے میں بنے ہوئے ستون کی محراب پر) زرد اور نیلے کاشی کے ٹکڑوں (چینی کے رنگین چوکے) سے کوفی خط میں لکھا گیا ہے (الفاظ یہ ہیں:

بَنیٰ ھٰذِہِ القبۃ عبد اللہ: عبدالملک بن مروان امیر المومنین فی سنۃِ اثنتین وسبعین۔ تقبل اللہ منہ ورضی عنہ۔ آمین)

(یعنی اس قبے کو اللہ کے بندے عبدالملک بن مروان امیر المومنین نے ۷۲ھ میں تعمیر کیا۔ اللہ اس کو قبول فرمائے اور اس سے راضی ہو۔ آمین)

تعمیر کے بعد کے منازل

جب عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں قبے کی عمارت کو کچھ نقصان پہونچا تو اس نے ۲۱۶ھ/۸۳۱ء میں اس کی مرمت کرائی۔ کاریگروں نے مامون کی خوشامد میں عبدالملک کے بجائے مامون کا نام کندہ کر دیا۔ نام تو بدل گیا مگر یہ غلطی کی کہ سالِ تعمیر بدلنا بھول گئے؛ (کہاں ۷۲ھ/۶۹۱ء کہاں ۲۱۶ھ/۸۳۱ء؟)

۱۰۱۶ء/ (فاطمی خلیفہ الحاکم بامراللہ کے عہد) میں زلزلہ آیا۔ اور قبہ نیچے چٹان پر گر گیا (ابن الاثیر: الکامل ۹: ۲۰۹)۔

اس کے چھ برس بعد الحاکم کے لڑکے الظاہر نے اسے از سر نو بنوایا۔ یہاں ایک ادھورا سا کتبہ موجود ہے جو فسیفساء کے مادے سے تحریر کیا گیا ہے جس کی تاریخ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء عہد الظاہر لاعزاز دین اللہ کی ہے۔

۱۰۹۹ء میں صلیبی یروشلم میں داخل ہوئے تو انھوں نے مسجد صخرہ کو کلیسا میں تبدیل کر دیا اور صخرہ کے اوپر ایک قربان گاہ تعمیر کر دی۔ جسے وہ 'Templum Domini' (ہیکل السید) کہتے تھے۔ مسجد کے بیشتر نقوش بدل دیئے۔ مسجد کے ایک حصہ کو کلیسا بنا لیا اور دوسرے حصہ کو اپنے جنگجو دستے کی قیامگاہ میں تبدیل کر دیا۔ مغربی سمت میں انھوں نے ایک نئی عمارت قائم کی جو ان کا اسلحہ خانہ تھی (ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ ۱۱: ۳۶۴) صلیبیوں نے قبے کے کلس پر سونے کی ایک صلیب کھڑی کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس واگذار کر لیا۔ قبے کے کلس پر سے سونے کی صلیب گرا دی گئی اور ساری نجاستیں دور کر دی گئیں۔ صخرہ کے گرد کی دیوار مع قربان گاہ کے ہٹا دی گئی۔ سنگ مرمر کی وہ پوشش بھی اکھاڑ دی گئی جو صخرہ کے اوپر بنا دی گئی تھی۔ فتح بیت المقدس کے بعد پہلا جمعہ مسلمانوں نے سلطان کی معیت میں مسجد صخرہ میں پڑھا (ابن الاثیر ۱۱: ۳۱۴)

"قبے کے اندر اب جو چیز نظر آتی ہے وہ سلطان صلاح الدین کے نصب کردہ کتبے ہیں جن میں اس نے صخرہ میں اپنی ترمیمات کے احوال تحریر کرائے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ مرمت ہوئی ہے۔"

بمبئی سے اسرائیلی حکومت کے سرکاری بلیٹن ((News from Issad)) یکم جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان موجود ہے کہ دیوار گریہ ((wailing wall)) پہلے ملبہ اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی۔ اور اس کا نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت دیدی تھی۔

"سلطان سلیمان قانونی کے عہد (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) میں پوری عمارت کی تجدید کی گئی۔ اس کے عہد میں قبہ الصخرہ کی عمارت میں کاشی کا استعمال (چینی کے رنگین چوکے) سب سے پہلی مرتبہ ہوا۔ اس سے پہلے فسیفساء سے زیب و آرائش کی جاتی تھی۔ بعد کے عثمانی سلاطین بھی مسجد الصخرہ سے غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان عبد المجید ثانی (۱۸۵۳ء) اور سلطان عبد العزیز بن محمود ثانی (۱۸۷۴ء) کے عہد کی ترمیمات عبد الملک بن مروان کی تعمیر کے بعد مسجد الصخرہ کی سب سے بڑی ترمیمات ہیں۔"
(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد ۱۶ ۱۱)

یہودیوں کی منصوبہ بندی کا آغاز ۱۸۸۰ء میں مہاجرت (Migration) کے سلسلے سے ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں مشہور یہودی لیڈر (Thedore Hertzel) (تھیوڈور ہرٹزل) نے صہیونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا — کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ کر کے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے! یہودی فری میسن تحریک (Heemason Movement) بھی اسی کی تائید کے لئے ہے!

"۱۹۳۶ء میں فلسطین کی اعلیٰ اسلامی کونسل نے الحاج مفتی محمد امین الحسینی کی صدارت میں حرم قدسی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لی۔"

"نومبر ۱۹۴۷ء میں تقسیم فلسطین کے اعلان پر عربوں اور یہودیوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں حرم قدسی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ یہودی مسجد کی چھت اور صحن میں گولے پھینکتے رہے"۔ "جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے حملہ کر کے پورے حرم شریف کو بمباری سے نقصان پہونچایا اور قبے کو بھی شدید نقصان پہونچایا"۔

سلطان عبد الحمید ثانی نے تمام مساجد میں ایرانی قالین بچھوائے تھے اور صخرہ کے اوپر ایک خوشنما اور عظیم الشان قندیل معلق کیا تھا — اسے ۱۹۵۱ء میں مسجد اقصیٰ میں منتقل کر دیا گیا۔

۲۲ر فروری ۱۹۵۹ء میں مملکت اُردنیہ کی مجلس وزرا نے ایک وفد کی تشکیل کی جس کے ذمہ عالم اسلام سے چندہ کر کے مرمت و اصلاح تھی۔

جون ۱۹۶۷ء سے پورا حرم شریف یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔ اور مسلمان اس کی واگذاری کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ لیکن اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔

بیت المقدس اس وقت اسرائیلی مملکت کا دار الحکومت ہے۔ اور شہر کو خوبصورت اور کشادہ بنانے کے بہانے عربوں کے محلے اور اسلامی آثار و مقامات مسمار کئے جا رہے ہیں۔ یہاں عبرانی یونیورسٹی ۱۹۲۵ء سے قائم ہے جس میں ۱۶۰۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں — اور Weizmanne Institute (ویزمین انسٹی ٹیوٹ) میں ۱۱۰۰ سائنسداں مصروف تحقیق و تفتیش ہیں۔

چونکہ قبے کے ساتھ انبیائے سابقین کی روایات وابستہ ہیں اور معراج کے موقع پر آنحضور کا گذر بھی اسی جگہ سے ہوا تھا۔ اس لئے مسلمان قبۃ الصخرہ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ کعبہ کے بعد مسجد نبویؐ اور اس کے بعد اسے تیسرا سب سے زیادہ مقدس مقام مانتے ہیں۔ اسے ثالث الحرمین کہتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ وہی جگہ ہے جس پر حضرت مسیحؑ نے لعنت بھیجی تھی۔ یہودیوں کے ہاں یہ جگہ پہلے قابل احترام و تعظیم تھی اور انھوں نے ایک طویل عرصہ تک اپنے آپ کو اس

کی زیارت سے محروم رکھا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہاں کسی مقام پر ان کی توراۃ مدفون ہے لیکن اب وہ ہیکل کی تلاش میں یہاں کھدائیوں میں مصروف ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور، جلد ۱۶ (۱))

البلاغ کویت ۲۰ دسمبر ۱۹۸۱ء رقمطراز ہے کہ "اب یہودیوں کا آخری منصوبہ یہ ہے کہ (۱) 'مسجد اقصیٰ' اور 'قبۃ الصخرہ' کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے اور (۱۱) پورے علاقہ (نیل سے فرات تک بلکہ حجاز کا پورا بالائی علاقہ) پر قبضہ کیا جائے۔ اس اسکیم کی پشت پناہی تو امریکہ کر ہی رہا ہے۔ امریکہ کا New York Times اخبار اس وقت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں 'مسجد اقصیٰ' کی جگہ 'معبد الجبل' اور عربی قدس کو 'مشرقی قدس' کے نام سے پکار پکار کر یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ گویا یہ پہلے ہی سے یہودیوں کی نگرانی میں تھے۔ اور جب نیویارک میں مقیم عربوں اور مسلمانوں کے ایک وفد نے بذریعہ ٹیلیگرام 'نیویارک ٹائمز' کے مدیر امور خارجہ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی کہ وہ دستاویز نقشے اور وثائق پیش کر کے اسرائیل کے غلط پروپیگنڈے کی لغویت ثابت کر دے تو اس کو قطعی نظر انداز کیا گیا۔ دراصل اسرائیل کی یہ کوشش ہے کہ وہ عربی اور اسلامی تمدن کے آثار و نقوش بدل کر رکھ دے خواہ ان کا تعلق دین سے ہو، تاریخ سے ہو یا تہذیب سے ہو۔"

مسجدِ عمرؓ

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور جلد ۱۶ صفحہ ۲۳۲ پر درج ہے "قبۃ الصخرہ" جسے مسجد عمرؓ بھی کہا جاتا ہے، حرم قدسی کے وسیع رقبے کے ایک حصہ میں واقع ہے۔ اکثر روایات کے بموجب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر اس جگہ ایک مسجد تعمیر کی تھی (ابن البطریق: التاریخ المجموعۃ علی التحقیق والتصدیق، ص، ۲/۱) یہ قبہ ایک چٹان (صخرہ) پر بنایا گیا ہے اور اس کی پیروی میں بعد میں ایسے متعدد قبے دار عمارتیں حدود حرم میں تعمیر کی گئیں۔

"جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس فتح کیا (اور حرم قدسی کی زیارت کی) تو بیت المقدس

کے پادری Sophronius (صفرونیوس) سے کہا کہ میں یہاں مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بنانا چاہتا ہوں۔ پادری انھیں صخرہ کے پاس لے آیا۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ یہ جگہ بری طرح نجاست سے اٹی پڑی ہے۔ چنانچہ وہ خود نجاست اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے لگے ان کے رفقاء اور فوج کے سپہ سالار بھی صفائی میں شریک ہو گئے۔ یہاں تک کہ چٹان عیاں ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے چٹان کو خوب صاف کیا اور اسی جگہ مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔

"القلقشندی کا بیان ہے: بادشاہ قسطنطین ' (Constantine) ' کی والدہ ملکہ ہیلانہ نے یہودیوں کی عداوت میں اس عمارت کو مسمار کر دیا جو صخرہ پر قائم تھی اور اس جگہ کو شہر کا کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے مخصوص کر دیا۔ جب امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے بیت المقدس کو فتح کیا تو اس وقت یہ جگہ اسی حالت میں تھی (۳۳۵ء تا ۶۳۶ء تین سو برس کا تو بہت زیادہ کوڑا کرکٹ رہا ہوگا) چنانچہ حضرت عمرؓ کو صخرہ کی جگہ نشاندہی کی گئی۔ انھوں نے اسے صاف کیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی (صبح الاعشیٰ ۴: ۱۰۱) اس بات کی تائید البکری نے 'فضائل القدس' میں اور جمال الدین احمد نے 'مثیر الغرام' میں کی ہے۔ R. Hartmann نے لکھا ہے: 'عمرؓ نے یہ مسجد صخرہ کی مغربی سمت یا جنوب مغربی سمت میں بنائی' (مجلہ (Dent Schen Polastina) صـ۱۹۵) اس جگہ مسجد عمر واقع ہونے کا ذکر سب سے پہلے بوزنطی مورخ تھیوفانسوس (Theophanes یا Theophansos) نے کیا ہے۔"

(Palestine under the Moslems: Le strange)

امام احمد کی روایت عن عبید بن آدم میں بیت المقدس کے متعلق یہ صراحت ہے کہ "جب امیر المومنین حضرت عمرؓ بیت المقدس پہنچے تب کعب سے پوچھا کہ مجھے نماز کہاں پڑھنی چاہئے؟ اس نے کہا صخرہ کے پیچھے۔ امیر المومنین نے کہا۔ نہیں میں وہاں پڑھوں گا جہاں نبیؐ نے پڑھی تھی۔" (مجمو ... یز جلد دوم صـ۱۴۰ تا صـ۱۴۶)

سر ولیم میور (Sir William Muir) (ایڈیشن دوم ۱۹۱۱ء) اپنی

تاریخ خلافت میں لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے وہ جگہ دیکھنے کی خواہش کی جہاں حضرت سلیمانؑ نے ہیکل تعمیر کیا تھا۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے سنٹ میری چرچ کے قریب اپنی نماز ادا کی جو مسجدِ اقصیٰ کی جگہ کھڑا تھا! انھوں نے قسطنطین کے گرجے یا دوسرے گرجوں میں بھی ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور جلد ۱۶(۱) کا ایک اور بیان (ص۲۹۶ وغیرہ) ملاحظہ ہو: "۶۳۶ء میں جنگِ یرموک کی فتح پر عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ (امیر المومنین) کو عیسائیوں سے معاہدہ کرنے کے لئے بلا بھیجا۔ وہ آئے اور صلحنامہ لکھوا دینے کے بعد بیت المقدس سے روانگی کے وقت صخرہ اور براق باندھنے کی جگہ کے قریب (آنحضرتؐ کی معراج کے موقعہ پر) جہاں انھوں نے اپنے ہمراہیوں سمیت نماز ادا کی تھی، ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہی مسجد بعد میں 'المسجد الاقصیٰ' کہلائی۔

"حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کے لئے بے روک ٹوک ان کے گرجاؤں کا استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی اور صرف معبد (یعنی ہیکل) کا رقبہ مسلمانوں کی عبادت کے لئے مخصوص کیا تھا۔ لیکن ۱۰۹۶ء میں یورپ کی متحدہ افواج نے جب قبضہ کیا تو صلیبیوں نے مساجد پر قبضہ کر کے انھیں گرجا بنا دیا 'قبۃ الصخرہ' (جسے وہ ناقص معلومات رکھنے کی وجہ سے 'Templum Domini' 'ہیکل السید' کہتے تھے) ویسے کا ویسا رہا، پھر بھی گنبد کی چوٹی پر سونے کی ایک صلیب لگا دی گئی 'صخرہ' (جو ابھی تک بیچ سے کھلا ہوا تھا) سنگِ مرمر کی سلوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ اور اس کے اوپر ایک قربان گاہ تعمیر کی گئی۔

"سلطان صلاح الدین نے جب فتح حاصل کی تو تبدیلیاں آئیں۔ اور انھوں نے اقصیٰ کے جنوب مغربی حصہ میں 'فرسان الہیکل' (Templar Knights) کا جو مخزن تھا اسے بدل کر اس کا نام 'مسجد النسار' رکھدیا 'جانبازانِ یوحنا دنی' (Israelites) کے وسیع اقامت خانہ کو مسجدِ عمرؓ کے لئے بطور وقف دیدیا گیا اور وہاں کے گرجا کو بدل کر 'مارستان' یا 'بیمارستان' کے نام سے شفاخانہ بنا دیا گیا"۔

بنی اسرائیل، یہود، یہودی اور عبرانی

'بنی اسرائیل' (Israelites) ابراہیمؑ کا ایک بیٹا اسمٰعیلؑ تھا دوسرا اسحاقؑ اسحاقؑ کے بیٹے کا نام یعقوبؑ تھا جنھیں 'اسرائیل' بھی کہا جاتا تھا۔ اسی لئے ان کی نسل والوں کو 'بنی اسرائیل' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی آبائی جائداد کنعان (فلسطین) کے علاقہ میں تھی۔ آج کل صرف 'اسرائیل' بھی انہی 'بنی اسرائیل' کو کہا جانے لگا۔

'یہود' و 'یہودی' (Jew)

کنسائز ڈکشنری میں ہے کہ 'Jew' - 'Judaea' ' سے ہے جسے نام ملا 'Judah' (یہوداہ) سے جو ایک قبیلہ کا نام تھا جسے اردن ندی کے مغرب میں پہلی سب سے بڑی قطعہ زمین ملی تھی۔ 'عبرانی' یا 'اسرائیل' کو بھی کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں میں سے 'یہوداہ' ایک قبیلہ کا نام تھا جسے بحر مردار کے مغرب کا علاقہ ملا تھا۔ پھر جب دس قبیلوں کی ایک شمال کی ریاست 'سلطنت اسرائیل' بنی تو اس کا دار الخلافہ سامریہ تھا۔ اور جنوب کی ریاست 'سلطنتِ یہوداہ' بنی جس کا دار الخلافہ یروشلم ہوا۔ دس قبیلے پہلے غائب ہو گئے اور آخر تک یہی جنوب کی ریاست والے 'یہوداہ' پھیلے۔ اس لئے بھی یہی نام سامنے رہ گیا۔

مصباح اللغات میں ھَادَ - یَھُوْدُ - ھَوْدًا کے معنی دیا ہے 'توبہ کرنا'، 'حق کی طرف پلٹنا' کہا جاتا ہے "ھَادَ الْمُذْنِبُ اِلَی اللّٰہِ"۔ گنہگار نے توبہ کی۔

لغات القرآن (جلد ششم) میں مولانا سید عبدالدائم الجلال صاحب نے لکھا ہے ھَادُوْا = یہودی ہوئے۔ مراد یہودی ہیں بچھڑے کی پوجا سے انھوں نے توبہ کی تھی اس لئے 'یہود' کہلائے (صادی و معالم) پشیمان ہونا۔ حق کی طرف لوٹنا۔ 'ھَائِدٌ' = توبہ کرنے والا حق کی طرف لوٹنے والا۔ 'ھُوْدٌ' اس کی جمع ہے۔

عبرانی (Hebrew)

کنسائز ڈکشنری کے الفاظ ہیں کہ " اس سے مراد ایک شخص ہے جو وادی فرات سے باہر کا رہنے والا ہو۔ یعقوبؑ کی نسل والوں میں سے ایک۔ ایک اسرائیلی۔ ایک یہودی یہودیوں کی زبان (ایک سامی زبان)

بائبل کے عہدِ عتیق کے باب پیدائش سے ہمیں سراغ ملتا ہے کہ طوفان کے بعد سام بن نوح کے ۵ بیٹوں میں سے ۲ بیٹوں ارفخشد اور لود سے عرب آباد تھا (۳ سے دجلہ و فرات کی وادی اور ایران کا مغربی جنوبی علاقہ آباد ہوا تھا) ارفخشد کے سلح اور سلح سے عیبر پیدا ہوئے۔ عیبر کے دو بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک یقطان (قحطان)۔ یقطان (قحطان) سے حضر موت وغیرہ ہوئے۔ اسی عیبر کے خاندان سے ابراہیمؑ بھی تھے اور سام بن نوح کو (پیدائش ۱۰: ۲۱) بنی عیبر کا باپ (the father of all the children of Eber.) کہا گیا ہے۔

آج عام طور سے 'یہود' سے مراد 'اسرائیل' اور 'اسرائیل' سے مراد 'یہود' 'یہودی' لیا جا رہا ہے! بات صاف نہیں ہوتی۔

محمد احمد باشمیل نے رسول کریمؐ کی جنگوں کے متعلق ایک کتاب تالیف کی ہے اس میں 'غزوہ بنی قریظہ' کے تحت 'یہود کا نسب نامہ' اس طرح بیان فرمایا ہے:

" اسرائیلی یہودیوں کا نسب یعقوبؑ کی طرف جاتا ہے جن کا لقب 'اسرائیل' تھا اور کلمۂ 'یہود' کا اشتقاق قولِ موسیٰؑ میں ملتا ہے۔ 'اِنَّا ھُدْنَا اِلَیْکَ' یعنی رجعنا وتبنا' کل یہودی اسرائیلی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہودیوں میں عرب در دم وغیرہ کے بہت سے دوسرے اجناس جو بنی اسرائیل میں سے نہ تھے داخل ہو گئے تھے جیسے بہت سے اسرائیلیوں کا دین یہودیت کے بجائے اسلام و مسیحیت ہو گیا تھا۔ اس لئے سب یہودی اسرائیلی نہیں ہیں۔ اور نہ سب اسرائیلی یہودی ہیں۔

آج دنیا نے حضرت موسیٰؑ کی طرف 'یہودیت' کو اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف 'مسیحیت' کو منسوب کر رکھا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ 'یہودیت' اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور 'عیسائیت' جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ ظاہر ہے 'یہودیت' اور 'نصرانیت' دونوں اس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔ بنی اسرائیل میں جب پستی و تنزلی کا دور آیا تو پہلے 'یہودیت' پیدا ہوئی پھر 'عیسائیت' نے جنم لیا۔ (تفہیم اول)

'خدا کا گھر'، 'قربان گاہ' (مذبح) اور 'طواف'

سیرت النبیؐ (حصہ پنجم) صد ۲۳۶ تا ۲۴۷ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا دستور تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہیں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ توراۃ (پیدائش) میں ان کی ۳ قربان گاہوں یا 'خدا کا گھر' بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔ مثلاً "اور ابراہیم اس ملک میں سے گذرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہونچا اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔ اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اسے دکھائی دیا تھا ایک قربان گاہ بنائی۔" "اور وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرہ ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا۔ اور وہاں اس نے خداوند کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خدا سے دعا کی۔"
(پیدائش ۱۲: ۵۔ ۷)

"اور ابرام نے اپنا ڈیرا اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں جا کر رہنے لگا اور وہاں خداوند کے لئے ایک قربان گاہ بنائی"۔ (پیدائش ۱۳: ۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے۔ اور آخر میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی۔ جو بنی اسرائیل کا کعبہ و قبلہ قرار پایا۔

حضرت اسحاقؑ کے لئے آیا ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی۔
"اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا۔ اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا۔" (پیدائش ۲۶:۲۵)
حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی۔ "اور یعقوب صبح سویرے اٹھا۔ اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس مقام کا نام 'بیت ایل' رکھا۔ اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا۔ اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا۔ دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دونگا۔" (پیدائش ۲۸: ۱۸-۲۲)
"اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور اس مقام کا نام 'بیت ایل' رکھا" (پیدائش ۳۵: ۱۵)
حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب۔ "اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے ۱۲ فرقوں کے لئے ۱۲ ستون بنائے۔ اور سلامتی کے ذبیح بیلوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے" (خروج ۲۴: ۴-۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام 'مذبح' یا قربان گاہ بتایا گیا ہے۔ اور دوسرا 'بیت ایل' (یعنی بیت اللہ) اور 'خدا کا گھر'۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا۔ اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ میں کعبہ، مسجدِ حرام کے نام سے آج تک قائم ہے۔ اور وہی دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے!

سیرت النبیؐ حصہ پنجم ص۲۵۳ پر 'طواف' کے متعلق درج ہے: "قدیم رسم یہ تھی کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے۔ یا نثار کرتے تھے۔ حج میں یہی 'طواف' کہلاتا ہے"۔
ص۲۶۶ پر درج ہے کہ "یہ اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر یا

قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی۔ چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے۔۔۔ اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے۔ اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتا ہے۔ "طواف" حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "خانۂ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے۔"

سوچنے کا دوسرا انداز

ہم اس طرح کیوں سوچیں کہ بنی اسرائیل فلسطین میں کئی بار خفیہ اور چپکے سے داخل ہو گئے اور اصل باشندوں کو قتل کر کے ان کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ قدیم باشندے دوسرے تھے، ملکی و غیر ملکی اور قومیت کی بیماری میں ہم کیوں مبتلا ہوں؟ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس، غلط سیاسی اغراض اور خواہ مخواہ کی رقابت و ہٹ دھرمی، طاقتور ممالک کی غلط سرپرستی نے تو شروع ہی سے قتل و غارتگری ساری دنیا میں پھیلا رکھی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں! آج بھی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا قانون تمدن کی دنیا میں بھی رائج ہے! بغاوتیں، باہمی جنگیں، جلاوطنی و امتناع داخلہ، قلعوں کو اڑا دینا، آثار کو مسمار کر دینا، قابل احترام شعائر کے ساتھ ناروا سلوک آج بھی جاری ہے!

اور ایسا بھی تو ہوا کہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کو رعائتیں دیں؟ سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی نے خود سے دیوار گریہ کے کوڑا کرکٹ کو صاف کروا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت دے دی؟

مسئلہ کی نزاکت پر متوجہ ہو کر سوچئے کہ انسان کی اخلاقی اصلاح کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ماشاء اللہ ختم نبوت تک اس کام کو بھی مکمل کر دیا۔ احکام الٰہی کے مجموعہ (قرآن کریم) کے ساتھ ساتھ اسوۂ حسنہ بھی رہتی دنیا تک کے لئے محفوظ و موجود ہے۔ اللہ کا یہ انتظام سارے انسانوں کی بہبودی کے لئے ہوا۔ اللہ کے نزدیک

سارے انسانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ حیات قابل قبول رہا ہے اور وہ ہے 'اسلام'! دنیا میں جتنے انبیاء مبعوث ہوئے وہ 'اسلام' ہی کی دعوت دیتے رہے خواہ وہ نوحؑ رہے ہوں یا ابراہیمؑ 'یعقوبؑ' موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اسمٰعیلؑ یا محمدؐ ؟ یہ اسکیم اللہ کی تھی! اس مسئلے کے حل کے لئے ہمیں معتبر اور مستند ذرائع سے جو رہنمائی ملتی ہو اس پر عمل کر کے نتیجہ دیکھنا چاہیے۔

يَآَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران۔ ۶۵۔ ۶۸)

(اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ توراۃ و انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا، اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہونچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔)

سورۃ الانعام میں اللہ نے رسول کریمؐ کو ہدایت کی ہے کہ "اے محمد کہو میرے رب

نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، 'ابراہیم کا طریقہ'"۔ حدیث بھی ہے کہ "کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہو۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں"۔ (بخاری و مسلم) دوسری حدیث اور ہے کہ "میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف (صحیح) الفطرت پیدا کیا تھا۔ پھر شیاطین نے آکر ان کو ان کے دین (ان کے فطری دین) سے گمراہ کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اصلی کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور نظام زندگی کو اللہ کی ہدایت کے مطابق درست کرنا تھا۔ ان کے بعد امامت کا منصب پہلے ان کی نسل کی بنی اسرائیل شاخ کو ملا۔ " یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ " (المائدہ) (اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے) اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے نامزد فرمایا۔ بیت المقدس (ہیکل) حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا۔ انھیں کے زمانہ میں قبلہ قرار پایا۔ اور جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔ لیکن ان کے اعمال کی پاداش میں ان کے خاندان سے نبوت کی لائن بدل دی گئی۔ اسی یروشلم کے سامنے شمال مشرقی پہاڑ زیتون پر چڑھ کر رات بھر عیسیٰؑ نے آہ وزاری کا ریکارڈ توڑ دیا اور بد دعا کی۔ اللہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ (سورہ البقرہ میں تفصیلات ہیں)

تم ہماری اس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے جو ہم نے تمہیں دی تھی۔ اس امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیم کے طریقے پر خود چلیں اور دنیا کو اس طریقے پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقے سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیت پوری طرح کھو چکے۔ لہٰذا تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔ اب ہم نے ابراہیمؑ

کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل میں وہ رسول پیدا کیا ہے جس کے لئے ابراہیم اور اسمٰعیل نے دعا کی تھی۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور دوسرے تمام انبیاء کا تھا۔ لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔

تحویل قبلہ اور نبی القبلتین

تبدیلِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویل قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا بیت المقدس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق رہا۔ خود نبی کریمؐ اور آپؐ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کر دیے گئے تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہو گئی۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ اب وہ مقام دینِ الٰہی کا مرکز ہے جہاں سے اس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتداء میں ابراہیمؑ کی دعوت کا مرکز بھی یہی مقام تھا اس لئے اہلِ کتاب اور مشرکین کسی کے لئے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہونچتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ سوم (ص۵۴، ۵۵) کا انداز ملاحظہ ہو: "حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا، اور ان کو ارضِ مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کے حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ توراۃ میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی ان کو سنا دیا گیا تھا کہ اگر انھوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا۔

"حضرت ابراہیمؑ کو اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ دو بیٹے عطا ہوئے۔ اور ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یعنی شام کا ملک حضرت اسحاقؑ کو اور عرب کا ملک حضرت اسمٰعیلؑ کو۔ شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا۔ حضرت اسحاقؑ کے فرزندوں

(بنی اسرائیل) کو بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی اور بنو اسمٰعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا۔

"حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں جس قدر پیغمبر پیدا ہوئے ان میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا اور اسمٰعیلؑ کا کعبہ تھا۔ گویا آنحضرتؐ سے پہلے جس قدر انبیاءؑ عرب یا شام میں مبعوث ہوئے وہ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولی تھے مگر آنحضرتؐ کو پھر دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی اور 'نبی القبلتین' کا منصب عطا ہوا یہی نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرتؐ کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی لئے معراج میں آپؐ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لیجایا گیا اور مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیاءؑ کی صف میں آپؐ کو امامت پر مامور کیا گیا۔ تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکارِ محمدیؐ کو عطا ہوتی ہے اور وہ 'نبی القبلتین' نامزد ہوتے ہیں"۔

رحمۃ للعالمین جلد اول کا انداز بھی ملاحظہ ہو: جب تک نبیؐ مکہ میں رہے اس وقت تک بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہا کیونکہ مشرکین مکہ بیت المقدس کے احترام کے قائل نہ تھے اور کعبہ کو تو انھوں نے خود ہی اپنا بڑا معبد بنا رکھا تھا اس لئے شرک چھوڑ دینے اور اسلام قبول کرنے کی بین علامت مکہ میں یہی رہی کہ مسلمان ہونے والا بیت المقدس کی طرف منھ کرکے نماز پڑھے۔ جب نبیؐ مدینہ پہونچے وہاں زیادہ تر یہودی یا عیسائی ہی آباد تھے۔ وہ مکہ کی المسجد الحرام کی عظمت کے قائل نہ تھے۔ اور بیت المقدس کو تو وہ (بیت ایل، یا ہیکل، تسلیم کرتے ہی تھے۔ اس لئے مدینہ میں اسلام قبول کرنے اور آبائی مذہب چھوڑ دینے کی علامت یہ ٹھہرائی گئی کہ مکہ کی مسجدِ حرام کی طرف منھ کرکے نماز پڑھی جائے! چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال (یا، ۱ ماہ بعد) خدا نے تحویل قبلہ کے بارے میں حکم نازل فرمایا۔ حکم الٰہی کے مطابق یہی مسجد ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کا قبلہ قرار دی گئی۔ چونکہ اسے تقدیم زمانی اور عظمتِ تاریخی حاصل ہے اس لئے اس کو قبلہ بنایا جانا مناسب ہے۔

سیرت النبیؐ جلد پنجم ص۲۶۷ پر درج ہے کہ "حجر اسود کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا۔ اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رُکن شامی ہے۔ اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے۔" (دیکھئے نقشہ قبلہ نما)

متذکرہ بالا باتوں سے یہی رہنمائی ملتی ہے کہ آج دنیا کے سارے مسلمان اور مسلم ممالک اپنا احتسابی جائزہ لیں۔ خدا کے احکام کی پوری اطاعت کریں۔ اسوۂ حسنہ کی صحیح پیروی کریں، توبہ و استغفار و انابت کے ذریعہ اپنی پوری اصلاح کرکے اپنے اندر تولیت سنبھالنے کی پوری اہلیت پیدا کرلیں۔ انشاء اللہ پھر وہ دن دور نہیں کہ انھیں اللہ کی نصرت نہ ملے ایہی اصل کام ہے دوسری طرف انھیں ایثار و قربانی کے ساتھ اپنے موجودہ انتشار اور سارے اختلافات کو دور کرکے فوری طور پر متحد ہو جانا چاہئے۔ پھر انھیں چاہیے کہ جوڑ کر اپنی مشترک اسکیم بنائیں حتیٰ الوسع اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تدبیر کریں اور اللہ ہی پر پورا توکل کریں۔ تب ہی صحیح نتائج کے حصول کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(ختم شد)

معلومات متعلقہ فارم ۴

رسالہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت : علی گڑھ

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔ نام پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر : سید جلال الدین عمری

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۴۔ نام اور پتہ مالک رسالہ : ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

میں سید جلال الدین عمری تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

دستخط : سید جلال الدین عمری

۳۱ر دسمبر ۸۲ء

بحث ونظر

اسلام اور جاہلیت کی کشمکش[1]

مولانا صدر الدین اصلاحی

انسان کا امتیازی وصف

نوع انسانی کا وہ امتیازی جوہر، جو اسے قدرت کی ایک شاہ کار مخلوق بناتا ہے دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، اس کی عقل ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اسے اپنے اعمال وحرکات کے سلسلے میں جواب دہ اور مستحق جزا وسزا ٹھہراتی ہے۔ اگر کسی کے اوپر کوئی چٹان لڑھک کر گر پڑے اور اسے زخمی کر دے یا جان سے مار دے تو کوئی بھی اس چٹان کو مجرم نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ وہ عقل اور شعور سے عاری ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مویشی کسی کی کھیتی چر ڈالے اور اس کو روند کر رکھ دے تو اسے مجرم ٹھہرا کر اس پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی جاتی۔ کیونکہ گو وہ شعور اور احساس رکھتا ہے مگر عقل و خرد نہیں رکھتا۔ لیکن ضرر رسانی کی ایسی ہی کوئی حرکت جب کسی آدمی سے سرزد ہوتی ہے تو قانون اور مذہب، سماج اور حکومت سب اسے اپنے اس فعل کا ذمہ دار اور جواب دہ سمجھتے اور لائق تعزیر قرار دیتے ہیں۔ صرف اس بنا پر کہ وہ شعور بھی رکھتا ہے اور عقل بھی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کے ایک ذمہ دار، مسئول اور مستحق جزا یا لائق سزا ہستی ہونے کی تمام تر وجہ اس کی عقل و فہم ہے۔

عقل کی نامرادیاں لیکن انسان کے ایک صاحب فہم و عقل ہستی ہونے کے معنی ہرگز

---

[1] زیر ترتیب کتاب "معرکۂ اسلام و جاہلیت" کا پہلا باب

یہ نہیں ہیں کہ اس کا ہر کام لازماً عاقلانہ ہی ہوا کرتا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے عقل و خرد کی ترازو میں ٹھیک ٹھیک تول کر ہی کرتا ہے۔ ایک طالب علم اپنا بیشتر وقت تفریحوں میں گزارتا رہتا ہے جبکہ دوسرا اپنے تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں لگا رہتا ہے۔ انسان ہونے کے باعث صاحب عقل ہستی دونوں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی شخص دونوں کو یکساں طور پر اپنی عقل کا صحیح استعمال کرنے والا نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح کے متضاد کرداروں کی مثالیں واقعات کی دنیا میں ہر طرف موجود دیکھی جا سکتی ہیں، جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنی اس امتیازی قوت کے صحیح استعمال میں جہاں کامیاب رہتا ہے وہاں ناکام بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اور شواہد بتلاتے ہیں کہ اس کی ناکامیوں کی فہرست کامیابیوں کے مقابلے میں کم طویل نہیں ہے۔ پھر بات اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی عقل کے صحیح استعمال میں ناکام ہوتا رہتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات وہ اس کا استعمال ہی نہیں کرتا، حتیٰ کہ اس کی سنی ان سنی ایک کر دیتا ہے۔ کتنے ہی شرابی، جواری، رہزن اور فحش کار آپ ایسے ہر جگہ پا اور دیکھ سکتے ہیں جو دل میں اپنے فعل کو خود بھی نادرست ہی سمجھتے ہوں گے، مگر پھر بھی کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس کا ارتکاب کیے جا رہے ہوں گے۔ اس سے جو حقیقت روشنی میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل قوت کا استعمال ہمیشہ نہیں کیا کرتا، اور جب کرتا بھی ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ صحیح بھی ہو، اور اگر وہ صحیح ہو بھی تو لازمی نہیں ہے کہ وہ اس کے کہے پر عمل بھی کرے۔

جب معمولی معمولی کاموں کے سلسلے میں عقلِ انسانی کے استعمال اور اس کی شنوائی کا یہ حال ہے تو خدا اور مذہب جیسے ماورائی مسئلے کے بارے میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا؟ دو پیسے کی امانت میں خیانت سے باز نہ رہنے والوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ایک لاکھ کی امانت میں سچے امین ثابت ہوں گے، بڑی سادہ لوحی کی بات ہوگی۔ جو انسان اپنے مرغوب دنیوی مفادات کے بارے میں بھی صحیح فیصلوں تک پہنچنے میں ناکام ہو جایا کرتا ہے، حتیٰ کہ صحیح فیصلے سوجھ جانے کے بعد بھی کسی وجہ سے ان کے مطابق عمل درآمد کرنے کی توفیق نہیں پاتا وہ اپنی عقل و فہم سے خدا اور اس کے دین کے معاملے میں دس فیصد بھی اگر صحیح فیصلے حاصل کر سکے اور پھر ان دس میں

دوایک کو بھی عملاً تسلیم کرلے سکے تو بہت بڑی بات ہوگی ۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی باب بھی مذہبی اختلافوں اور تصادموں کے تذکرے سے خالی نہیں ہے تو یہ دراصل عقل و دانش کو کبھی غلط استعمال کرنے، کبھی استعمال ہی نہ کرنے اور کبھی اس کے کہے کو جان بوجھ کر ٹھکرا دینے کا ہی نتیجہ ہے۔

عقل اور فطرت کے حجابات

یہ پہاڑ جیسی غلطی انسان سے کیوں سرزد ہوتی رہتی ہے ؟ اپنی سب سے قیمتی متاع، عقل اور فطرت سلیم کے ساتھ اس نے اس ظلم کو کیسے روا رکھا؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جو اس موقع پر لازماً ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس کا جواب معلوم کرلیا جائے۔

یوں تو اس غلطی اور اس ظلم کے اسباب و عوامل متعدد ہیں، اور بہت سی چیزیں ہیں جو دین و مذہب کے سلسلے میں آدمی کی عقل پر اور اس کی خیر پسند فطرت پر پردے ڈال دیا کرتی ہیں۔ لیکن ان میں سے تین ہی عوامل ایسے ہیں جن کا رول اس معاملے میں بنیادی ہوا کرتا ہے۔

۱۔ پہلا بنیادی اور نمایاں سبب تو آدمی کی جبلی ضرورتیں اور طبعی خواہشیں ہیں۔ یہ خواہشیں بڑی طاقت ور اور منہ زور واقع ہوئی ہیں۔ اگر انسان انھیں قابو میں نہ رکھ سکے، اور بالعموم ایسا ہی ہوتا بھی ہے، اور انھیں آزاد چھوڑ دے تو وہ بالکل بے لگام ہو رہتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے اندر کسی ایسے عمل اور اقدام کی ہمت، بلکہ اس کا ارادہ تک باقی نہیں رہنے دیتیں جو انھیں گوارہ نہ ہو۔ اور جب آدمی کسی اچھے کام کے کرنے کا ارادہ بھی کر سکنے کے قابل نہ رہ گیا ہو تو چاہے اس کی عقل کا کہنا کچھ بھی ہو اس پر وہ کان بھی نہیں دھر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لینے میں ناکام رہتا ہے شراب کا رسیا خوب جانتا ہے کہ یہ ام الخبائث اس کی صحت، اس کی دولت اس کا ذہنی اعتدال اور اس کی اخلاقی پاکیزگی، سب کو جاٹے لے رہی ہے، مگر ان ساری تباہ کاریوں کو آنکھوں دیکھتے ہوئے بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور بنا رہتا ہے اور عقل غریب

کی ایک سن کر نہیں دیتا۔ یہ امرِ واقعی اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔

۲۔ دوسرا بڑا سبب قومی تعصب، باپ دادا کی اندھی تقلید، موروثی افکار و عقائد اور رسوم و رواج سے گہری وابستگی ہے۔ آدمی معقول سے معقول بات کو بھی محض اس بنا پر حقارت سے ٹھکرا دیا کرتا ہے کہ وہ 'باہر' سے آئی ہوئی ہے اور اس کے اپنے قدیم ماضی کی مخالف ہے۔ گویا اس کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے اپنے ہاں کی ہو وہی صحیح اور قابلِ التفات ہے، اور اس کی قومی عزت و عظمت کا تقاضا ہے کہ اسے ہر حال میں دانتوں سے پکڑے رہے۔ یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہو گی کہ وہ اس کے غلط اور قابلِ ترک ہونے کا تصور بھی دل میں لائے۔

۳۔ تیسرا عام اور وسیع و عالمگیر سبب فکر و نظر کی خامی ہے۔ ایسے لوگ کثرت سے ہر طرف موجود دیکھے جا سکتے ہیں جو دین کے سب سے اہم اور سب سے نازک مسئلے پر غور و فکر کرتے بھی ہیں تو غور و فکر کا حق ادا نہیں کرتے۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ سطحی اور بے تکا ہوتا ہے اور ان کے استدلال میں پھسپھساپن اور بھینگاپن کام کر رہا ہوتا ہے۔ چند قدم چلے نہیں کہ غلط رخ پر مڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ خدا کو بھی مانتے ہوں گے اور آخرت کے محاسبے کو بھی تسلیم کرتے ہوں گے، مگر اس 'ماننے اور تسلیم کرنے' کی تفصیل میں جانے کے بعد ان کا یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہو کر رہ جاتا ہو گا۔ تکوینی حیثیت سے تو وہ ساری عظمتوں کا مالک اللہ رب العالمین ہی کو سمجھتے ہوں گے، اسی کو ساری کائنات کا خالق اور پروردگار، آقا و حکمراں مانتے ہوں گے۔ مگر اس کی تشریعی حیثیت کا سوال سامنے آتے ہی اسے عرش سے اتار کر فرش پر لا بٹھاتے ہوں گے، اور اسے کبھی دنیا کے حکمرانوں پر قیاس کر کے 'شرک' کی گندگی میں جا گرتے دکھائی دیں گے، اور کبھی اس کی ذات واجب الوجود کو فانی مخلوقات پر قیاس کر کے 'تشبیہ' کی گمراہی میں جا پڑتے نظر آئیں گے، حالانکہ ان میں سے ہر قیاس بداہتہً قیاس مع الفارق ہوتا ہے۔

یہی حال ان کے نام نہاد ایمان بالآخرت کا بھی ہو گا۔ قیامت، آخرت اور محاسبۂ اعمال

کو تسلیم کرنے کا انھیں دعویٰ بھی ہوگا، مگر ساتھ ہی کچھ ہستیوں کی شفاعت کے بل پر بہر حال پروانۂ مغفرت حاصل کر لینے کا من مانا عقیدہ بھی رکھتے ہوں گے، جس کے بعد آخرت اور اس کے محاسبے پر ایمان رکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں باقی رہ سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے لفظوں میں پہلے سبب کا نام "حجابِ طبع" یا "حجابِ نفس" دوسرے کا "حجابِ رسم" اور تیسرے کا "حجابِ سوءِ معرفت" ہے[1]۔

عقل انسانی کے ان حجابات میں سے کسی کی بھی کارستانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بنی آدم کی بہت بڑی اکثریت انہی حجابات کی تاریکیوں میں گم، اور ان کی پیدا کی ہوئی محرومیوں کا شکار بنتی چلی آرہی ہے۔ غیر دینی معاملات سے تو انھیں کوئی خاص غرض نہیں ہوتی، مگر خدا اور مذہب کے معاملے میں وہ آدمی کے دل و دماغ پر کالی گھٹا بن کر چھا جایا کرتے ہیں، اور پھر ایسا بہت کم ہونے پاتا ہے کہ وہ چھٹ جایا کریں الا لمن یشاء اللہ۔

مذاہب کی تقسیم

یوں تو دنیا میں بے شمار مذاہب پائے جاتے ہیں، مگر دیانت اور صداقت کی کسوٹی پر اگر کس کر دیکھا جائے تو وہ دو ہی قسموں میں منقسم نظر آئیں گے: صحیح اور برحق مذہب، اور غلط و ناحق مذہب۔ صحیح اور برحق مذہب تو ایک ہی ہے، اور ایک ہی ہو سکتا ہے، جب کہ غلط اور حق سے ہٹے ہوئے مذہب متعدد ہیں اور یہ اس لئے کہ ان میں سے جو مذہب عقل و دانش کے صحیح فیصلہ کے مطابق ہوگا اسی کو برحق کہا جا سکے گا، اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ عقل و دانش کا صحیح فیصلہ ایک ہی ہو سکتا ہے جب کہ اس کے غلط استعمال کے کئے ہوئے فیصلے بہت سے ہو سکتے ہیں۔

یہی ایک صحیح و برحق مذہب ہے جسے "اسلام" کہتے ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول صـ۵۶

جتنے مذاہب اور نظامہائے فکر و عمل ہیں ان سب کی تعبیر کے لئے ایک جامع لفظ 'جاہلیت' ہے۔ جاہلیت کا لفظ سن کر کان نہ کھڑے کرنے چاہئیں، نہ برا ماننا چاہیئے۔ یہ اسی ایک سچے مذہب' اسلام کی ایک اصطلاح ہے، اور اس سے مراد مذہبی یا اخلاقی نوعیت کی ہر وہ چیز اور طور طریقہ ہے جس کا سرچشمہ اللہ کا دین، یعنی اسلام نہ ہو۔ ایسی ہر چیز کو جاہلیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد، کم ازکم اسلام کی نگاہ میں، اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی ہدایت اور وحی پر نہ ہوگی جو بے آمیز اور عنداللہ پسندیدہ ہو۔ بلکہ براہ راست یا بالواسطہ، اس کے ماننے والوں کے اپنے جذبات اور اپنی ذاتی پسند پر ہوگی، اور عربی زبان وادب کی رو سے اسی اتباع جذبات کا نام جاہلیت ہے۔[1]

جاہلیت کی دین بیزاری اور دنیا نوازی

جاہلیت کے اندر نشو و نما اور ارتقاء کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مسلسل ترقی کرتی اور انسانی ذہن میں مضبوطی سے جمتی چلی جاتی ہے۔ اور جوں جوں اس کے اندر وسعت اور گہرائی آتی جاتی ہے، عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیم سے اس کی دوری بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت چل کر وہ آدمی کے ذہن سے اس تصور کو بھی نکال باہر کرتی ہے کہ وہ 'انسان' ہے، اور یہ باور کرا دیتی ہے کہ وہ بس اونچے درجے کا ایک حیوان ہے۔ اور یہ خیال ایسا خیال ہوتا ہے جس کے بطن سے مادیت، عشق دنیا، خود غرضی، لذت پرستی، ظلم، سرکشی، استکبار اور فساد فی الارض جیسی برائیوں کے سوا اور کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ انانیت کی حد یہ ہوتی ہے کہ یہ انسان نما مخلوق مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کا نعرہ بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہتی۔ اور اگر اس جذبۂ انانیت

---

[1] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے 'جاہلیت' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے اور بالکل صحیح بیان کیا ہے :۔
"ہر وہ کام جاہلیت کا کام ہے جسے لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا لیکن اسلام نے اسے برقرار نہیں رکھا۔ پس امور جاہلیت میں وہ ساری چیزیں داخل ہیں جنھیں لوگ اپنائے ہوئے تھے اگرچہ اسلام نے ان کا نام لے لے کر ان سے منع نہ کیا ہو" (اقتضاء الصراط المستقیم ص۵۳)

نے مذہبی بھیس میں ظہور کرنے کی سوچی تو اللہ رب العالمین تک کو چیلنج دے دیتی ہے اور اسے، بزعم خویش، کائنات کی فرماں روائی سے معزول کر کے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کا اعلان کر دیتی ہے۔

ابھی جو یہ واضح کیا جا چکا کہ جاہلیت سے مراد ہر وہ مذہبی یا اخلاقی نوعیت کا کام یا خیال یا طور طریقہ ہے جس کا سرچشمہ اسلام نہ ہو، اس سے اِس سوال کے اٹھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ جب جاہلیت عقل کے غلط استعمال کا یا عدم استعمال کا نام ہے تو ان قوموں کو دنیوی اور تمدنی حیثیت سے بھی انتہائی پسماندہ ہونا چاہئے جو اسلام کے بقول 'جاہلی' قومیں ہوں۔ 'مذہبی نوعیت' کی قید اس سوال کو بالکل خارج از بحث قرار دے دیتی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ کر دیتی ہے کہ یہ جاہلیت وہ 'جاہلیت' ہے جس کی مار آدمی کی اس سوجھ بوجھ پر نہیں پڑا کرتی جس کا تعلق دنیا کے معاملات و مفادات سے ہوتا ہے بلکہ عقل انسانی کی کارکردگی کے صرف اخلاقی رخ پر حملہ کرتی ہے، اس کے طبعی اور مادی رخ سے تعرض نہیں کرتی۔ کیونکہ انسان کا مادی ترقی کی سمت میں بڑھنا اس کے مقصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا، بلکہ بالعموم معاون و مددگار ہی بنا کرتا ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ انسان کو جس قدر زیادہ معاشی، تمدنی اور سیاسی عروج حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا رشتہ خدا اور آخرت، دین اور اخلاق سے عموماً کمزور پڑتا جاتا ہے۔ اور یہی جاہلیت کو مطلوب ہے۔ پھر وہ لوگوں کی دنیوی ترقی کی راہ میں بھی مزاحم کیوں بنے۔ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قومیں جہاں اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بانجھ ہوتی ہیں وہاں دنیوی اور مادی حیثیت سے بڑی عاقل اور 'زرخیز' بھی ہو سکتی ہیں، ہوتی رہی ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ چنانچہ جن جاہلیت زدہ قوموں کی اخلاقی موت کی داستانیں ابھی آگے آ رہی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے زمانوں کی نہایت ترقی یافتہ قومیں رہی ہیں۔ عاد اور ثمود کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے کہ جہاں وہ اخلاق اور دین کے معاملے میں اندھے پن کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے تھے وہاں دنیا اور اس کے معاملات کے سلسلے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ (وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔

عنکبوت۔ ۳۸) قوم عاد اتنی زور آور اور باجبروت تھی کہ دنیا نے اب تک ایسی قوم دیکھی نہ تھی، اور تمدنی شان و شوکت بھی اس کی بے مثال تھی (اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ۔ فجر) نیز فوجی طاقت کے لحاظ سے اپنے عہد کی "سپر پاور" تھی (وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ۔ شعراء: ۱۳۰) قوم ثمود کی بابت قرآن بتاتا ہے کہ وہ بھی اپنے دور کی انتہائی ترقی یافتہ قوم تھی۔ علم و فن، خصوصاً فنِ تعمیر میں کمال کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ میدانی علاقوں میں اس نے شاندار محل، اور کوہستانوں میں پہاڑوں کو تراش کر بڑے بڑے مکان اور قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ (تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا۔ اعراف۔ ۷۴) قوم شعیب تجارت کے میدان کی شہسوار تھی اور اپنی کوششوں اور شاطرانہ چالوں سے اپنے کاروبار کو بام عروج پر پہنچائے ہوئے تھی۔ قوم فرعون کا جاہ و جلال دنیا پر روشن ہی ہے۔ قریش مکہ ایک طرف عرب کے "برہمن" بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف بحر احمر کے کنارے کنارے گذرنے والی بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کے گویا تنہا مالک تھے۔ یہ ساری شہادتیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ جاہلیت کو اگرچہ عقلِ انسانی کے اخلاقی رجحانات سے انتہائی بیر ہے مگر اس کا مادّی رجحان اور دنیوی معاملات میں اس کی کارکردگی نہ صرف یہ کہ اسے ناپسند نہیں بلکہ بڑی محبوب ہے۔

اسلام اور جاہلیت کی دائمی کشمکش

اختلاف خصوصاً دینی افکار کے سلسلے کے اختلاف کا یہ مزاج ہی نہیں کہ اپنی حدوں میں خاموشی کے ساتھ سمٹا رہے۔ اس کے بخلاف یہاں ہر فریق کی زبردست خواہش اور مسلسل کوشش رہتی ہے کہ وہ مخالف کو زیر کرلے۔ اس لئے خیر و شر اسلام اور جاہلیت میں شروع ہی سے ایک کشمکش برپا ہے، جو نہ کبھی ختم ہوئی ہے نہ کبھی ختم ہونے والی ہے ٹکرانے کو تو شر و جاہلیت کے مختلف مظاہر اور مکاتب فکر بھی باہم ٹکراتے رہتے ہیں، مگر ان کا ٹکراؤ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کی باہمی آویزش سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ یہ آویزش اکثر اوقات صلح و مسالمت میں بھی بدل جایا کرتی ہے۔ مگر اسلام اور جاہلیت کا ٹکراؤ ایسا ٹکراؤ ہے جو ناپیدا کنار

ہے۔ یہ کبھی بقائے باہم کی سوچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ان دونوں کی باہمی جنگ سب سے زیادہ کھلی ہوئی، سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ سخت و شدید ہوتی ہے۔

دنیا کا سارا ہنگامہ بڑی حد تک انہی دونوں پیدائشی حریفوں، اسلام اور جاہلیت، کی کشاکشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ایسی ضد واقع ہوئی ہیں کہ ایک کی زندگی دوسرے کی موت کا نام ہے۔ جس طرح رات کی فطری تاریکی کسی ایک ذرے پر بھی سورج کی کرنوں کا پرتو گوارہ نہیں کرسکتی، اور جس طرح سورج کی تیز نگاہیں کسی گوشے میں بھی تاریکی کے کسی دھبے کو باقی نہیں دیکھ سکتیں، ٹھیک اسی طرح عالم باطن کی روشنی اور تاریکی بھی ایک دوسرے کی جانی دشمن ہیں اور ان کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ باطل کی ہر ادا حق کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، اور حق کی ہر آواز باطل کے لئے یکسر قابلِ نفرت قرار پاتی ہے۔

ان دونوں قوتوں کی اس دائمی کشمکش کا 'محور' انسان کی ذات ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسے پوری طرح فتح کرلینا چاہتی ہے۔ اور ان کی اسی کشمکش میں اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ نتیجے کے طور پر انہی کی ہار جیت پر اس کی سعادت اور شقاوت موقوف رہتی ہے۔

وحی الٰہی کی رہنمائی اور مدد

اسلام اور جاہلیت کی اس زبردست کشاکش کی منجدھار میں پڑے ہوئے انسان کو اس کے خالق اور پروردگار نے اپنے حال پر نہیں چھوڑ رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے اس آزمائش سے اس کے سرخ رو نکل سکنے کے لئے تدبیروں اور کوششوں کا سارا بوجھ اس کی اپنی عقلی قوت اور فطری صلاحیت ہی پر ڈال رکھا ہو۔ حالانکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تب بھی انصاف کے خلاف نہ ہوتا۔ مگر یہ صرف "خشک" اور نرے قانونی انصاف کی بات ہوتی۔ ایسے انصاف کی بات نہ ہوتی جو اس خالق اور پروردگار کے رؤف و رحیم اور ہادی و حکیم ہونے کے شایانِ شان کہی جاسکتی۔ اس لئے اس کی مشیت کا بجا طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ انسان کو اس آزمائش میں

کامیاب ہونے کے لیے عقل اور فطرتِ سلیم کے سوا کچھ اور بھی دے، ایسی چیز دے دے جو اس کی عقل کو بہکا دے سے، اور اس کی فطرت کو بہلا دے سے بچا لینے والی ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو وحیِ الٰہی کہتے ہیں۔ یہ وحیِ الٰہی انسان کی عقل کو روشنی دکھاتی اور اس کی فطرت کا تزکیہ کرتی ہے یہاں تک کہ اس کے اندر فرشتوں سے بھی بازی لے جانے کی طاقت پیدا کر دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ خود اس کا طالب ہو۔ یہ وحی سراپا ہدایت ہوتی ہے، جو پوری وضاحت اور کامل صراحت کے ساتھ انسان کو بتا اور سمجھا دیتی ہے کہ حق یعنی اسلام کی صراطِ مستقیم فی الواقع کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صورت کیسی ہے؟ اس کے متعین تقاضے کیا ہیں۔ باطل یعنی جاہلیت سے اس کی سرحدیں کس کس طرح الگ ہوتی ہیں؟ اور اس کی پیروی انسان کے لئے کیوں ضروری ہے؟ اس آسمانی ہدایت کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کی اپنی آزاد مرضی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو نہ صرف یہ کہ یہ سارا ہنگامۂ حق و باطل سرد پڑ کر رہ جاتا، بلکہ انسان کے پیدا کئے جانے کا مقصد بھی فوت ہو رہتا۔ جو کوئی اس رہنمائی کے قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس فیصلہ کو عمل کی شکل دے دیتا ہے، وہ اس کی عقل کو "فرقان" عطا کر دیتی اور اسے صحیح معنوں میں "اُولُوا الاَلبَاب" (اہلِ دانش) کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ جو کچھ سوچتا ہے ٹھیک رخ سے سوچتا ہے، جو کچھ کرتا ہے صحیح ڈھنگ سے کرتا ہے، اس کا ہر قدم صحیح ارتقار کا قدم ہوتا ہے، اور اس کی زندگی خوش کام نیک انجام زندگی بن جاتی ہے۔ اسی حقیقتِ واقعی کو سامنے رکھتے ہوئے اس رہنمائی کو اللہ رب العالمین کی سب سے بڑی نوازش ہی کہا جا سکتا ہے، جسے قرآن حکیم نے بالکل بجا طور پر "رحمت" اور "نعمتِ کاملہ" فرمایا ہے، لیکن جس کے ایک بڑے حصہ (شریعت) کو اسرائیلی نادانوں نے، اُس وقت جب ان پر دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی موت طاری ہو گئی تھی، "لعنت" قرار دے دیا تھا، اور آج "متمدن" اور "روشن خیال" دنیا اس سے بھی کچھ زیادہ کہہ رہی ہے۔ اسلام اسی وحیِ الٰہی کا اصطلاحی نام ہے، اور توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد اس کے بنیادی پتھر ہیں، جن پر خدا کی بندگی کا ایک پورا نظامِ فکر و عمل تشکیل پائے ہوئے

ہے۔ یہ عقائد اور یہ نظام بندگی انسان کے پورے وجود کو حق کے سانچے میں ڈھال دینے اور خیر کا پیکر بنا دینے کا تنہا ذریعہ ہیں، کامل اور کافی و شافی ذریعہ۔

جاہلیت کی یلغار

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وحی اور اس رہنمائی کے عطا کئے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہلیت اس کے آگے دم بخود ہو کر رہ گئی ہوگی، اور اب انسان اس کے حملوں کے اندیشے سے آزاد ہو گیا ہوگا۔ وہ اتنی بودی اور کم ہمت نہیں ہے کہ وحی و ہدایتِ الٰہی کا نام سن کر از خود ڈگیں ڈال دیتی۔ اس کے میگزین میں اسلحوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس لئے وہ جس طرح انسان کی عقل کو گھیرے میں لے لیتی ہے اسی طرح اس کی مدد اور رہنمائی کے لئے اوپر سے آنے والی اِس وحی الٰہی پر بھی ہلہ بول دیا کرتی ہے۔ اور اس کے اِس ہلے کا خاص نشانہ اس وحی الٰہی کی بنیادی تعلیمات توحید۔ رسالت اور آخرت۔ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ ہدایت الٰہی کی اس آہنی فصیل کو توڑ دینے کے بعد ہی اس کی فاتحانہ پیش قدمی کے لئے راہ ہموار ہو سکے گی۔

جن لوگوں پر یہ حملے کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی عقلیں حق و صداقت کے بارے میں ماؤف ہونے لگتی ہیں اور ان کے منہ ہدایتِ الٰہی کی طرف سے مڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ادھر سے منہ مڑے نہیں کہ نفسانیت اور جاہلیت پوری تیزی سے ان پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ پھر وہ جس قدر اس کی گرفت میں آتے جاتے ہیں اسی قدر وہ فطرتِ سلیم کی روشنی سے محروم دینی حقائق کے ادراک سے عاجز اور حق شناسی کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب ان کے دلوں کا زنگ آلود آئینہ سچائی کا کوئی عکس قبول کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا اور ان کا ذہن مادیت کے حصار کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اگر انسانی زندگی کا کوئی ماورائی مقصد رکھا جائے، خالص اور مکمل خدا پرستی کی دعوت پیش کی جائے، رسالت کی ضرورت اور آخرت کی اہمیت بیان کی جائے، حقیقی علم کی نشان دہی کی جائے اور اس طرح انھیں سچی فلاح کی راہ دکھائی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ ان باتوں

کے ماننے پر تیار نہ ہو سکیں گے بلکہ انھیں بالکل ہی ناقابل فہم سمجھیں گے، ان پر حیرت کا اظہار کریں گے، دیوانگی کی بڑ قرار دیں گے، اور پھر یا تو ادعائے دانش مندی کی ایک خاص شان کے ساتھ زیر لب مسکرا کر رہ جائیں گے یا ہاتھوں میں پتھر اٹھالیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ وہ کیا سن رہے ہیں؟ اپنی عقل و فہم کو ان اعلیٰ حقائق سے اس قدر بیگانہ اور ناآشنا پائیں گے کہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھر لیں گے، اور فرمائیں گے کہ ان 'بے ہنگم' باتوں کا پیش کرنے والا یا تو دیوانہ ہے یا سحر زدہ ہے، شاعری کر رہا ہے یا جھوٹا اور مفتری ہے، اور ڈھونگ رچا کر اپنی کوئی خاص غرض پوری کرنا چاہتا ہے۔

تاریخ کی شہادتیں

مذاہب کی، اور انبیائی دعوتوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے، ورق ورق پر یہی داستان لکھی ہوئی ملے گی بالکل ایک سے لفظوں میں ملے گی۔ کیونکہ جاہلیت کا مزاج ہمیشہ یکساں رہا ہے، اور اسلام کی فطرت بھی کبھی بدلنے والی نہیں۔ اس لئے ان دونوں میں جب بھی ٹکراؤ ہوا اس ٹکراؤ کی کیفیت اور نوعیت بھی سدا ایک ہی سی رہی اور اس کا انجام بھی ایک جیسا رہا:۔

(۱) قومِ نوحؑ

تاریخ کا معلوم دور حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ آپؑ صرف 'آدمِ ثانی' ہی نہیں ہیں، بلکہ ان انبیاء کے سلسلے کی پہلی کڑی بھی ہیں جن کی نبوتوں اور دعوتوں کا تاریخی ریکارڈ اس وقت محفوظ پایا جا رہا ہے۔ آپؑ کی دعوت کے تاریخی ریکارڈ کی ضروری تفصیل یہ ہے:۔

حضرت نوحؑ نے جب اپنی دعوت کا اعلان کر کے دعوتِ حق کا پہلا اور بنیادی نکتہ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تمام جھوٹے اور خود ساختہ معبودوں کو چھوڑ کر صرف خدائے واحد کی بندگی کرو تو ان کے بڑوں اور سربراہوں (مَلاءِ قوم) نے اسے سختی کے ساتھ رد کرتے ہوئے اپنے عوام کو تلقین کی کہ:۔

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا	اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور کبھی
تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا	نہ ترک کرنا (حضرت) وَد اور سواع کو،
وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا	اور نہ (حضرت) یغوث کو، یعوق کو
(نوح۔ ۲۳)	اور نسر کو۔

اور حضرت نوح کو انھوں نے یہ جواب دیا کہ:۔

اِنَّا لَنَرٰكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	ہم تمہیں کھلی ہوئی گم راہی میں مبتلا دیکھ
(اعراف۔ ۶۰)	رہے ہیں۔

یعنی ان 'دانش مندوں' کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو لاشریک ماننا کوئی معمولی ضلال نہ تھا، بلکہ 'ضلال مبین' تھا، ایسا ضلال تھا جس کے ضلال ہونے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتی تھیں، اور یہ بات دو دو چار کی طرح واضح اور بدیہی تھی کہ اگرچہ اس عظیم کائنات کو پیدا کیلے اللہ ہی نے کیا ہے لیکن اسے چلا رہے ہیں بہت سے خدا، اور بہت سے خدا ہی اسے چلا سکتے ہیں، اور یہ صریح نادانی اور گمراہی کی بات ہے کہ خدائی کے سارے اختیارات اور حقوق صرف ایک ہی خدا کے لئے مختص سمجھ لئے جائیں۔ حضرت نوحؑ نے انھیں جواب دیا کہ امر واقعی وہ ہرگز نہیں ہے جو تم سمجھ اور کہہ رہے ہو، بلکہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ ضلال مبین میں میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ تم خود مبتلا ہو، اور اس لئے ہو کہ تمہاری عقل ماری گئی ہے اور تمہارے دل و دماغ پر جہل اور جاہلیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ (وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ہود۔ ۲۹) اور پھر جاہلیت کا یہ پردہ اس وقت تک نہ ہٹ سکا جب تک کہ اس کا اخلاقی نتیجہ ظہور میں نہ آگیا اور خدائے قہار کا عذاب ان پر برس نہ پڑا۔ اور بعضوں کی آنکھ پر تو یہ پردہ اس وقت بھی پڑا ہی رہ گیا، وہ اب بھی خدائے قادرِ مطلق کو کوہِ جودی سے فروتر گمان کرتے رہے۔

اسی طرح جب آپؐ نے اپنی رسالت پر ایمان لانے کا ان سے مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں بھی اسی انکار، حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا گیا جو دعوتِ توحید کے سلسلے

میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا' بالفرض معبود کوئی ہو اور اس نے چاہا بھی ہو کہ ہم انسانوں کے پاس اپنا کوئی پیام بر بھیجے، تب بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی جیسے ایک آدمی کو اس غیر معمولی منصب کے لئے اس نے منتخب کیا ہو؟ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو، پھر کس منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ میں خدا کا فرستادہ ہوں؟ اگر اللہ کو اپنا کوئی فرستادہ مقرر کرنا ہی ہوتا تو اس نے اپنے کسی مقرب فرشتہ کو مقرر کیا ہوتا (مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ..... وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۔ المومنون ۲۴)
اور یہ کہہ کر انھوں نے نہ صرف یہ کہ آپؑ کے نبی ہونے کو ناقابلِ فہم اور ناقابل قبول ٹھہرا دیا بلکہ پورے سلسلۂ رسالت کا اور نفس رسالت ہی کا انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک حضرت نوحؑ ہی نہیں، سارے انبیاء بشر ہی ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر بشریت کی 'دلیل' کی بنا پر آپؑ کو نبی نہیں مانا جا سکا تو یہ صرف آپؑ ہی کی نبوت کا انکار نہیں تھا، بلکہ سبھی نبیوں کی نبوت کا اور نفس نبوت ہی کا انکار تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی خود قرآن نے تصریح فرما رکھی ہے (كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۔ شعراء ۔ ۱۰۵)
پھر یہ انکار بھی انکارِ محض نہیں تھا، بلکہ تعجب بھرا انکار تھا۔ ان کے اسی تعجب کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا:۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ	اور کیا (تم میری نبوت کے منکر ہو اور تمہیں)
ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى	اس بات پر حیرت ہے کہ تمہارے رب
رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ	کی طرف سے تمہارے ہی اندر کے ایک آدمی
وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ	پر حق کی یاد دہانی آئی ہے، تاکہ وہ تمہیں (آخرت
تُرْحَمُوْنَ	سے) خبردار کر دے اور تاکہ تم خدا کی ناراضی
(اعراف ۔ ۶۳)	سے بچ سکو اور توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے؟

حضرت نوحؑ کے اس ارشاد میں دعوتِ حق کے سارے ہی بنیادی عناصر موجود تھے، اور قوم کا اظہارِ تعجب ان سبھی باتوں پر تھا۔ آپؑ کے کہنے کا مطلب یہ تھا جب اللہ تعالیٰ ہی تمہارا

رب ہے تو اس کی ربوبیت صحیح معنوں میں ربوبیت ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر وہ تمہاری اخلاقی اور روحانی ربوبیت اور پرورش کا بھی کوئی سامان نہ کرتا، جب کہ اس نے تمھاری جسمانی پرورش اور مادی ضرورتوں کی فراہمی کا اتنا وسیع، مکمل اور حکیمانہ نظام قائم کر رکھا ہے جس کا تم اپنی کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہو۔ تمہاری اخلاقی اور روحانی تربیت کا یہی ناگزیر نظام تو ہے جو اللہ کے 'ذکر' یعنی اس کی وحی اور ہدایت کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس 'ذکر' کو تم تک پہنچانے کے لئے اگر ایک انسان کو، اور خود تمہارے اپنے ہی اندر کے ایک فرد کو منتخب کیا گیا ہے تو ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ اس ذکر کی غرض و غایت اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب حسب ضرورت اس کی تشریح اور تفہیم بھی ہوتی رہتی اور اس کی پیروی کا عملی نمونہ بھی تمہارے سامنے آتا رہتا، ورنہ اس کی مطلوبہ پیروی کا طریقہ اجمال کے دھندلکے میں بڑی حد تک چھپ کر رہ جاتا، اور اللہ کی بھیجی ہوئی تعلیمات کے سارے گوشے اور تقاضے تم پر واضح نہ ہو سکتے اور جب ان تعلیمات کے سارے گوشے اور تقاضے واضح نہ ہو سکتے تو ان کی پیروی کا حق بھی ادا نہ ہو سکتا۔ یہ عظیم مصلحت اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب تمہارے ہی جیسے جذبات و احساسات اور تمہاری ہی جیسی فطری ضرورتیں رکھنے والی کسی مخلوق کو اس منصب رسالت پر مامور کیا جاتا۔ اور یہ مخلوق بداہۃً انسانی مخلوق ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہ بشری ضرورتیں رکھتی ہے نہ انسانی جذبات اور احساسات کا ادراک کر سکتی ہے، اور جب وہ ان ضرورتوں اور جذبات و احساسات کا ادراک نہیں کر سکتی تو وہ تمہارے مسائل کو سمجھ بھی نہیں سکتی، اور جب وہ نہ تمہاری فطری ضرورتوں اور مانگوں کو محسوس کر سکتی نہ ان ضرورتوں اور مانگوں کی بنا پر پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھ سکتی تو ان کے سلسلے میں تمہاری مبنی بر ضرورت اور مبنی بر حق رہنمائی بھی نہیں کر سکتی تھی اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تم کو ایک بشر کے رسول خدا ہونے پر تعجب ہو۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ تم انسانوں کی رہنمائی کے لئے کسی انسان کو نہیں، بلکہ کسی فرشتے کو یا کسی اور مخلوق کو رسول بنا کر

تمہارے پاس بھیج دیا جاتا۔

انکار اور اظہار تعجب کے سارے زور و شور کے باوجود حضرت نوحؑ اپنی دعوتی سرگرمیوں میں برابر لگے ہی رہے، جیسا کہ ایک داعیِ حق کی حیثیت سے انھیں لگا رہنا ہی چاہیے تھا انھوں نے لوگوں کے ذہن پر سے جہل اور ہٹ دھرمی کا زنگ کھرچ پھینکنے کی کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کی عقلوں کو بھی جھنجھوڑتے رہے اور ان کے انسانی جذبات سے بھی اپیل کرتے رہے۔ سمجھاتے رہے اور برابر سمجھاتے رہے۔ آہستہ بھی سمجھایا اور بالجہر بھی سمجھایا۔ اعلان کے ساتھ بھی سمجھایا اور اسرار کے ساتھ بھی سمجھایا۔ مگر قوم کا رٹا رٹایا جواب یہ ہوتا کہ "یہ تو ایک پاگل آدمی ہے" (اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ بِهٖ جِنَّةٌ۔ مومنون۔ ۲۵) اور اس سے ان کا مدعا آنجنابؐ کو صرف ایک خاص انداز کی گالی دے دینا نہیں تھا، بلکہ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ جس طرح کسی پاگل شخص کی باتیں سراسر بے عقلی اور بدعقلی کی ہوتی ہیں اور ان کے اندر کسی ربط کسی شائستگی اور کسی معقولیت کی تلاش فضول ہے، ویسا ہی اس شخص کی باتوں کا بھی حال ہے۔ لیکن اس 'پاگل' اور مجنون نے، جس کے 'جنون' پر ہزاروں ہوش مندیاں فدا ہوں، اس گالی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا، اور ان کی سوئی ہوئی عقلوں کو جگا دینے کے لئے برابر کوشاں ہی رہے۔ مگر یہ عقلیں تو غفلت کی نہیں، موت کی نیند سو چکی تھیں (اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ۔ اعراف۔ ۶۴) اس لئے ان کا آخری فیصلہ بھی اس کے سوا کچھ نہ ہو سکا کہ:۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ	نوح! اگر تم (اب بھی اپنی بکواس سے)
لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ	باز نہ آئے تو ہم تم کو ضرور ہی پتھر مار مار
(شعراء۔ ۱۱۶)	کر ہلاک کر دیں گے۔

آخرکار اس سین کا اس وقت پردہ گر گیا جب زمین سے امنڈا اور آسمان سے ٹوٹا ہوا طوفانِ ہلاکت ہر طرف چھا گیا۔ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ہود۔ ۴۴)

(۲) قومِ ہودؑ (عاد)

قومِ نوحؑ کے بعد قومِ عاد تاریخ عالم کی ایک مشہور اور زبردست قوم کی حیثیت سے ابھر کر نمایاں ہوئی اور حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اللہ کے رسول کی حیثیت سے تشریف لائے۔ دونوں طرف پھر وہی صورتِ حال تھی۔ قوم سرتاپا جاہلیت میں غرق تھی۔ اس لئے آپؑ کی دعوت کا بلند ہونا تھا کہ ایک سخت کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ اِدھر سے دینِ حق کی جو بات بھی پیش کی گئی اُدھر سے اس کا جواب انکار، استعجاب، استہزاء اور اظہارِ غیظ کی شکل میں دیا گیا۔ ہدایت الٰہی کے ہر نکتے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تو بڑی عجیب وغریب بات ہے، ایسے خیالات تو آج تک کبھی سننے ہی میں نہیں آئے تھے، ان کا ماننا نہ ماننا تو بعد کا مسئلہ ہے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باتیں کسی طرح قابلِ فہم ہیں بھی ؟ آخر یہ کوئی سمجھ میں آنے والا دعویٰ ہے کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہے ہی نہیں، نہ ہو سکتا ہے ؟ اور اس خدا سے ہم حقیر انسانوں کا راست تعلق ہے، اور اس کی جناب میں اپنی گذارشیں پہنچانے کے لئے کسی شفیع کی ضرورت بھی نہیں۔ پھر تمہارا یہ کہنا بھی کتنا عجیب ہے کہ تمام لوگوں کو مر کر مٹی ہو جانے کے بعد ایک روز از سر نو زندہ کیا جائے گا۔ بھلا یہ دعویٰ کبھی مان لئے جانے کے قابل ہو سکتا ہے کہ جو بات ہزاروں برس گذر جانے کے باوجود آج تک کبھی ظہور میں آتے دیکھی نہیں جا سکتی وہ یقیناً ظہور میں آکر رہے گی۔ ایسی لایعنی بکواس پر بہ سلامتی ہوش وحواس کوئی کیسے کان دھر سکتا ہے ؟ ہمارے ایسے ایسے بزرگ تو ان نام نہاد حقائق سے بے خبر گذرتے چلے گئے، مگر آج تم جیسے ایک معمولی شخص پر سب کچھ منکشف ہوگیا ہے ! جو شخص خود بھی ہمارے ہی جیسا ایک بشر ہو اور جو عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا، سوتا جاگتا، بیمار پڑتا اور تکلیفیں جھیلتا اور اپنی ضروریات کے لئے بازاروں میں چلتا پھرتا ہو وہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس رب السمٰوات والارض کے پاس سے پیام آیا ہے اور میں اس کا سفیر اور ایلچی ہوں، تو اس کے اس مہمل دعوے کو صبر کے ساتھ کون سن سکتا ہے ؟ غرض علمِ حق کی

ایک ایک بات ان جاہلیت مآبوں کے لئے ناقابل فہم اور موجب حیرت ثابت ہوئی۔ توحید کا پیغام سنا تو جھڑکتے ہوئے بولے:۔

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ	کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم
وَنَذَرَ مَا كَانَ	اکیلے ایک خدا کی بندگی کریں اور ان سب
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا	معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے
(اعراف۔ ۷۰)	اسلاف پرستش کرتے رہے ہیں؟
اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا	کیا تم ہمارے پاس اس غرض سے آئے
عَنْ اٰلِهَتِنَا	ہو کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے
(احقاف۔ ۲۲)	برگشتہ کر دو؟

اور آخری بات یہ کہ:۔

مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ	ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو
قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ	ہرگز نہیں چھوڑنے کے، اور تمہاری باتیں
بِمُؤْمِنِيْنَ (اعراف)	کبھی مان نہیں سکتے ہیں۔

ایسا ہی ردِعمل آپؑ کی نبوت اور آخرت کے بارے میں ظاہر کیا گیا، جیسا کہ ان کے اس ردِعمل پر حضرت ہودؑ کے اس متعجبانہ اظہارِ خیال سے صاف واضح ہوتا ہے:۔

.... اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ	..... کیا تم میری بات نہ مانوگے) اور
ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى	تمہیں اس بات پر حیرت ہے کہ تم ہی
رَجُلٍ مِّنْكُمْ	میں سے ایک شخص کے پاس تمہارے
لِيُنْذِرَكُمْ ..... الخ	رب کی طرف سے 'ذکر' آیا ہے تاکہ تمہیں
(اعراف۔ ۶۹)	(آخرت کی باز پرس سے) خبردار کردے؟

اور نہ صرف یہ کہ ان کا ردِعمل انکار اور تعجب کا رہا۔ بلکہ آگے چل کر اس نے چیلنج کی شکل بھی اختیار کرلی۔ انھوں نے جیسے تنگ آکر کہا:۔

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ

اچھا تو (اب) لے ہی آؤ وہ عذاب جس کی ہمیں دھمکی دے رہے ہو اگر تم سچے ہو۔ (احقاف - ۲۲)

غرض ان کے لئے دینِ حق کی بنیادی تعلیمات میں سے ہر چیز ایک اعجوبہ اور عقل و فہم سے یکسر بعید تھی، اوران کا اصرار تھا کہ یہ شخص پرلے درجے کا جھوٹا اور عقل و خرد سے گیا گذرا ہے۔

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ

یقیناً ہم تمہیں حماقت میں مبتلا پا رہے ہیں اور ذرا شبہ نہیں کہ تم پکے جھوٹے ہو۔ (اعراف - ۶۶)

جواب میں آنجناب نے انھیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور فرمایا "اے میرے لوگو! میں ہرگز مبتلائے حماقت نہیں ہوں۔ ذرا ٹھہر کر سنجیدگی کے ساتھ سوچو تو سہی کہ میری کون سی بات حماقت کی ہے؟ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا رسول اور ہادی ہوں۔ کیا تم اتنی واضح بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو کہ تم لوگوں کو حق و صداقت کی اور فلاح و سعادت کی راہ دکھانا تمہارے پروردگار کی پروردگاری کا لازمی تقاضہ تھا۔ رہی یہ بات کہ اس غرض کے لئے اس نے مجھے اپنا ایلچی بنایا ہے، اور میں اس دعوے میں سچا ہوں، تو میری پیش کی ہوئی تعلیمات کی معقولیت پر غور کرو، میرا اب تک کا کردار اور اخلاق دیکھو، میری پیروی کے پاکیزہ نتائج پر نظر ڈالو، کیا یہ سب کچھ میرے برحق اور صادق ہونے کی شہادت نہیں ہے؟ مگر عقل کے اندھوں نے ان کی ایک نہ سنی کر دی اور ان کی تعلیمات کو بدستور ناقابل فہم قرار دیتے رہے، اور حضرت ہودؑ کی زبان سے ان باتوں کے نکلنے کی وجہ ان کی سمجھ میں صرف یہ آسکی کہ ہمارے کسی معبود نے اس شخص کی گستاخیوں پر ناراض ہو کر اس کی عقل مار دی ہے (إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۔ ہود - ۵۴) اور پھر ان مدہوشوں کو ہوش اسی وقت آسکا جب سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلنے

والی بادصرصر نے انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا (سورہ حاقہ ۶-۷)

(۳) قوم صالحؑ (ثمود)

قوم عاد کے بعد اس کے بقایا ثمود' اس کے جانشین ہوئے، اور حضرت ہود کی لائی ہوئی ہدایتِ الٰہی کے امین بنے۔ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہ امانت خیانت کی نذر ہونے لگی اور رفتہ رفتہ یہ قوم بھی جاہلیت کی آغوش میں جا پڑی۔ حضرت صالح علیہ السلام اس کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے، اور ایک بار پھر حق و باطل کا معرکہ گرم ہوگیا۔ نبوت سے پہلے حضرت صالحؑ قوم کے چشم و چراغ سمجھے جا رہے تھے اور ان سے وہ بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھی۔ مگر اپنی نبوت کا اعلان اور توحید کی پکار بلند کرتے ہی وہ اس کے لئے بڑی قابل نفرت شخصیت قرار پا گئے، اور لوگوں نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے ان سے کہا:۔

يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا	صالح! اب تک ہمیں تم سے بڑی
مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا اَتَنْهٰنَآ	امیدیں رہی ہیں (لیکن اب یہ کیا ہوا
اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ	ہے کہ) تم ہمیں ان معبودوں کی پرستش
اٰبَاؤُنَا .... الخ	سے روک رہے ہو جن کو ہمارے
(ہود - ۶۲)	اسلاف پوجتے رہے ہیں؟

دعوتِ توحید ہی کی طرح آپؑ کے دعوائے نبوت کو بھی ٹھکرا دیا گیا، اور اس کی نسبت سے آپ پر تبصرہ یہ کیا گیا:۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ	تم تو نرے سحر زدہ ہو، تم اس کے سوا
مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔	اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہی جیسے ایک
(شعراء ۱۵۳، ۱۵۴)	بشر ہو۔

قوم کے اس تبصرے میں وہی ساری بوالعجبیاں موجود تھیں جو حضرت نوحؑ اور

حضرت ہود علیہما السلام کی قوموں کے جوابات میں پائی جاتی رہی ہیں، اور جن کی ضروری تفصیل آپ ابھی پڑھ چکے ہیں۔

(۴) قوم لوطؑ

حضرت صالحؑ کے بعد جن اور انبیا کی بعثت ہوتی رہی، کم وبیش اسی طرح کے جوابوں اور تبصروں سے انھیں بھی 'نوازا' جاتا رہا، یہاں تک حضرت لوط علیہ السلام کی باری آئی آپؑ کو بعض نئی باتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ آپؑ کی قوم اعتقادی جاہلیت کے ساتھ ساتھ ایک گھناؤنی قسم کی اخلاقی نوعیت کی جاہلیت میں بھی لت پت تھی۔ اس لئے آپؑ نے اسے توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی پاکیزگی کی بھی زبردست تلقین کی۔ مگر چند ایک کو چھوڑ کر کسی نے بھی کوئی بات نہ سنی۔ سننا تو درکنار ان 'نکٹوں' نے ان کی 'ناک' کا الٹا مذاق اڑایا۔ گویا پچھلے انبیاء کی قومیں جہاں صرف بے عقلی اور بد عقلی کا شکار رہی تھیں وہاں یہ ناہنجار قوم بے عقلی اور بد عقلی کے علاوہ عقلی سڑاند کی لعنت میں بھی گرفتار تھی۔ اس لئے توحید، آخرت اور رسالت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ گل افشانیاں کیں وہ تو کیں ہی، دنیا کی مسلمہ اخلاقی غلاظت کے خلاف بھی کوئی نصیحت اور تلقین گوارہ نہ کی، اور پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ الٹا حضرت لوطؑ اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں پر طنز کرتے ہوئے بولے "یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں"۔ (اِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُوْنَ۔ اعراف۔ ۸۲) جاہلیت کے ان بے باک پیروؤں کے بیٹے کی آنکھیں جب اس حد تک پھوٹ چکی تھیں تو انھیں حق وصداقت کے اعلیٰ حقائق کس طرح اپیل کر سکتے تھے۔ اس لئے حضرت لوطؑ کی کوئی ایک بات بھی ان کی سمجھ میں نہ آسکی، اور بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بہت ہو چکا اب اس 'عجیب وغریب مصیبت' سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے، اور ان 'بکواسیوں' کو دیس نکالا دے دینا چاہیئے (اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ۔ ایضاً)

(۵) قوم شعیبؑ

کچھ مدت کے بعد جب اہل مدین اور اصحاب الایکہ نے جاہلیت کی باگ ڈور سنبھالی تو رحمت الٰہی نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو مامور کیا۔ یہ لوگ بھی اپنے پیش رووں سے کچھ مختلف نہ نکلے اور انھیں بھی جب حق کا تریاق پلانے کی کوشش کی گئی تو اس کی تلخی اور سمیت کی شکایت ہوگئی۔ قوم لوطؑ کی طرح یہ بھی اعتقادی گم راہیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور خاص اخلاقی عیب، تجارتی بدعنوانیوں کے عیب، میں بڑی شہرت حاصل کئے ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت شعیبؑ نے انھیں توحید اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی اس عیب کی طرف بھی ان کی توجہ دلائی۔ اس کی وجہ سے دعوتِ حق کو ایک نیا تجربہ اور جاہلیت کا ایک خاص اندازِ فکر و استدلال روشنی میں آیا۔

دعوتِ توحید کے جواب میں انھوں نے کہا:۔

يَاشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ	اے شعیبؑ! کیا تمہاری یہ نماز تمہیں
تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ	یہ حکم دے رہی ہے کہ ہم ان معبودوں
مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا	کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے اسلاف
(ہود۔ ۸۷)	پوجتے رہے ہیں؟

"جنھیں ہمارے اسلاف پوجتے رہے ہیں" کہنے سے ان کا مدعا بس ایک تاریخی حقیقت کا یاد دلا دینا نہیں تھا، بلکہ اس جملے کے اندر دراصل ان کا اپنے مسلک کے حق میں ایک بہت بڑا 'استدلال' پوشیدہ تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ایسے عالی مقام بزرگوں کے مقابلے میں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ اس لئے ہم اس بات کو کیسے معقول مان لیں کہ وہ تو راہِ راست سے ناآشنا تھے اور تم پر امرِ حق روشن ہے؟ ان بزرگوں کا فلاں فلاں ہستیوں کو معبود ماننا غلط تھا اور تمہاری بات صحیح ہے؟

آپ کی نبوت کی بات سن کر بولے باولے ہو گئے ہو تم پر جادو کرکے تمہاری عقل ماری گئی ہے، جھوٹ بکتے ہو کہ اللہ رب العالمین کے فرستادے ہو۔ ہمارے ہی جیسے ایک معمولی بشر ہوتے ہوئے مالک الملک کے فرستادے کیسے ہو سکتے ہو؟ (اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ۔ شعراء ۱۸۵-۱۸۶)

جب آپؑ نے ان کی کاروباری بے ایمانیوں پر ان کو ٹوکا اور سمجھایا کہ اپنے تمدنی اور معاشی نظام کو بدعنوانیوں سے پاک کرو، ناپ تول میں چھل فریب سے کام لینا چھوڑ دو، جو کہ تمہارے ہاں ایک متفقہ 'معروف' بنا ہوا ہے، تو بھڑک اٹھے، اور کہنے لگے یہ روٹی روزی کے معاملے میں اخلاق کو کہاں گھسائے دے رہے ہو؟ کیا ہم تمہارے اس احمقانہ فلسفے پر اپنے معاشی مفادات کو قربان کر دیں؟ ترازو کی ڈنڈی مارنے کی کارگر تدبیر سے جو فائدے ہمیں حاصل ہوتے ہیں، محض اس لئے چھوڑ دیں کہ آخرت میں اس سے نقصان ہوگا، اس آخرت پر، جو بجائے خود کوئی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض وہ کبھی آنے والی ہو بھی تو اس کی خاطر اپنی دنیا کو برباد کر دینا اور نقد کو نسیہ پر نثار کر دینا کون سی عقل مندی ہے؟ بڑے 'حلیم' اور 'رشید' بننے چلے ہو، تمہاری نماز اگر توحید اور آخرت کا اور اخلاق و صفائی معاملات کا حکم دیتی ہے تو تم بطور خود اس پر عمل کرتے رہو، ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو کہ اپنا مجرب طریقہ چھوڑ دیں؟ مذہب کا معاملہ ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے، دوسروں پر اپنے مزعومات کو مسلط کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ (قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ۔ ہود۔ ۸) پیغمبرؑ نے ان کی اس کج فکری اور اس جاہلانہ تصور مذہب کو پھر درست کرنے کی کوشش کی، ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگا کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے کی نصیحت کی، انجام سے ڈرایا، جزا و سزا کے بارے میں خدا کی دائمی سنت یاد دلانا چاہی، مگر آپ کی کوئی نصیحت، کوئی تلقین اور کوئی تہدید ان کے دلو

دماغ کے بند دروازوں کو کھول نہ سکی، وہ انکار پر انکار کرتے رہے، اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا	شعیبؑ! تمہاری اکثر باتیں تو ہماری
مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ	سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور اپنے درمیان
فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ	ہم تمہیں کمزور پا رہے ہیں، اگر تمہارا قبیلہ
لَرَجَمْنَاكَ ۔ (ہود - ۹۱)	نہ ہوتا تو ہم تمہیں ضرور ہی سنگسار کر دیتے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ "تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں" چاہے جس ادعائے دانش مندی کے نشہ میں، اور کتنے ہی گہرے طنز کے ساتھ کہی گئی ہوں، مگر اس میں ذرا شبہ نہیں کہ امرِ واقعی کے عین مطابق تھی۔ جاہلیت کے عشق نے ان کی عقل کو اس حد تک اپنا معمول بنالیا اور ان کی انسانی فطرت کو اس قدر مسخ کر ڈالا تھا کہ عقلِ سلیم کو اپیل کرنے والے علمِ حق کے روشن ترین حقائق کو سمجھ سکنے کی کوئی صلاحیت ان میں باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ جس طرح ایک پیدائشی اندھا ہزار سمجھانے کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سفیدی کیا چیز ہوتی ہے اور سرخی کسے کہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح شرک اور کفر اور فسق و فجور میں مدتِ دراز سے ڈوبے ہوئے شخص کے ذہن میں بھی نہ یہ حقیقت اتر پاتی کہ ذاتِ واحد کے سوا اور کوئی بھی ہستی لائقِ پرستش نہیں، اور نہ یہ کہ اللہ رب العالمین کی طرف سے انسانوں کو حق کی تعلیم دینے کے لئے خود انہی میں سے کچھ افراد پیغامبر کی حیثیت سے مبعوث ہوا کرتے ہیں، اور نہ یہ کہ سبھی لوگ مرنے کے بعد ایک روز دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانے والے ہیں تاکہ ان کی زندگی بھر کے اعمال کا حساب لیا جائے اس لئے اس قوم نے حضرت شعیب سے اگر لَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ کہا تھا تو ازروئے واقعہ کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

آپ نے اوپر کے صفحات میں قدیم زمانوں کی کچھ مشہور قوموں کے بارے میں قرآن کریم کا یہ جو بیانِ واقعہ پڑھا ہے اور ابھی آگے چل کر بھی پڑھیں گے، کہ ان کے لئے توحید اور

آخرت اور رسالت ہر ایک کی بات ایک اچنبھے کی بات ثابت ہوتی رہی، تو ان کا یہ اظہار تعجب بھی دراصل اسی " لَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ " کا مظہر ہوتا تھا۔

(۶) قوم فرعون

شب و روز کی گردش حسب معمول جاری رہی۔ یہاں تک کہ سرزمین مصر میں قبطی قوم کو عروج ملا اور فرعونی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ لوگ پوری طرح جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب مصر میں چند صدیوں قبل جاکر آباد ہوجانے والے بنی اسرائیل کی اصلاح و ہدایت اور رہنمائی کے لئے، نیز فرعون کے مظالم سے انھیں نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام معبوث ہوئے تو قبطی قوم کو حق کی دعوت دینے کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔ انبیائی طریقِ دعوت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے قوم کے سربراہ کی حیثیت سے فرعون اور اس کے درباری امراء کو اپنا پہلا مخاطب بنایا۔ فرعون کے دربار میں جاکر اس کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور توحید کی دعوت پیش کی۔ اس دعوت کا پیش ہونا تھا کہ واقعات کے پردے پر پھر وہی مناظر نمودار ہونے لگے، اور برابر ہوتے رہے، جو حضرت نوحؑ کے زمانے سے لے کر اب تک نمودار ہوتے چلے آرہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو نبوت کے مقام پر فائز کرکے حکم ہوا:۔

اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ	کہ ظالم قوم کے پاس جا۔ فرعون کی قوم
قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ	کے پاس۔ کیا یہ لوگ (اپنے انجام
(شعراء ۔ ۱۰۔۱۱)	کی طرف سے) بالکل بے خوف ہیں۔

جس قوم کا اللہ جل مجدہ نے گویا نام ہی القوم الظّٰلمین (ظالم قوم) رکھ دیا ہو اندازہ کیجئے کہ وہ حق سے کتنی دور اور باطل و جاہلیت کی کیسی دلدادہ رہی ہوگی، اس لئے اس دعوت کا جو جواب اس ظالم قوم نے دیا وہ توقع کے ٹھیک مطابق یہ تھا کہ:۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ	ہم نے تو ایسی باتیں اپنے پہلے کے

آبَاءِ نَا الْاَوَّلِیْنَ (قصص۔۳۶) بزرگوں سے کبھی نہیں سنیں۔

اس چند لفظی جملہ میں انکار بھی تھا، استعجاب بھی تھا، اور اس کی دلیل بھی تھی۔ دلیل یہ تھی کہ جب ایسے ایسے بزرگ نہ خدا کو ایک اور لاشریک مانتے اور کہتے تھے نہ قیامت اور آخرت کا تصور رکھتے تھے اور نہ کسی عام انسان کے بارے میں یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ وہ خالق و مالکِ کائنات کا فرستادہ مقرر ہو سکتا ہے تو آج ایک معمولی شخص کی زبان سے نکلی ہوئی یہ نئی اور انوکھی باتیں کیسے مان لی جا سکتی ہیں؟ اور ان کے معقول و قابلِ غور ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟

خیر قوم تو اسی حد پر رک گئی کہ وہ صرف ظالم تھی، مگر فرعون صرف ظالم ہی نہیں ظالموں کا سردار، اور سردار ہی نہیں بزعم خویش ان کا 'الٰہ' اور 'ربِّ اعلیٰ' تھا، اس لئے وہ ظلم اور سرکشی کے انتہائی اور غیر معمولی مظاہرے کے بغیر کیسے رک سکتا تھا۔ سو اس نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور لاشریک معبودیت کے انکار سے آگے بڑھ کر اپنی مملکتِ عصر کی حد تک اس کی ربوبیت، آقائی اور حاکمیت کا بھی سرے سے انکار کر دیا، اور اسے ناقابلِ قبول ہی نہیں ناقابلِ فہم قرار دے دیا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے بھرے دربار میں جا کر اعلان کیا کہ:۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (شعراء۔۱۶) بالیقین ہم رب العالمین کے فرستادے ہیں۔

تو وہ فوراً بول اٹھا:۔

وَمَا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (شعراء۔۲۳) اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟

اس کے اس سوال میں استعجاب تو ضرور تھا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ دہریہ اور منکرِ خدا تھا۔ جب وہ خود اپنی الوہیت کا مدعی اور 'ربِّ اعلیٰ' ہونے کا دعوے دار تھا تو دہریہ کیسے ہو سکتا تھا؟ چنانچہ قرآن مجید کے اندر اس کے جن دوسرے اقوال کو مختلف مقامات پر نقل کیا گیا ہے ان میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ وہ خالق و مالکِ کائنات

ہی کا نہیں فرشتوں کا بھی قائل تھا (ملاحظہ ہو سورہ زخرف آیت ۵۳) اس کے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا ملکِ مصر کی حد تک میں ہی سب کچھ ہوں، اس مملکت کا فرماں روائے مطلق بھی ہوں اور اس کے باشندوں کا معبود اور ربِ اعلیٰ بھی ہوں۔ اور یہ اس کا قہر اور جاہلیت کا سحر تھا کہ پوری قبطی قوم اس کے اس دعوے کے آگے سپر ڈالے ہوئے تھی، جسے قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے کہ "اس نے اپنی قوم کو بے وزن بنا رکھا تھا اور وہ اس کے حضور پوری طرح سرِ تسلیم خم کئے ہوئے تھی" (فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ زخرف۔ ۵۴) پس وہ رب العالمین اور فرماں روائے کائنات کی ہستی کا منکر نہیں تھا، بلکہ ایسے رب العالمین اور فرماں روائے کائنات کا منکر تھا، بلکہ یوں کہئے کہ منکر بنا ہوا تھا جس کی ربوبیت اور فرماں روائی ملکِ مصر پر بھی اسی طرح قائم اور جاری وساری ہو جس طرح باقی کائنات پر قائم ہے۔ اپنے اسی احمقانہ دعوے کی بنا پر، قدرتی طور پر، اس کا خیال یہ تھا کہ میں کسی بیرونی ہدایت کا ہرگز محتاج نہیں ہوں۔ موسیٰؑ جھوٹ کہتا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔ میرے پاس کسی نبی کے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر بالفرض باقی کائنات کے فرماں روا کو مجھ فرماں روائے مصر کے پاس اپنا کوئی ایلچی بھیجنا ہی ہوتا تو کسی ایسے عالی مرتبہ شخص کو بھیجتا جو اگر خود فرشتہ نہ ہوتا تو اس کے جلو میں کچھ فرشتے ضرور ہوتے جو اس کے آگے ہٹو بچو کی منادی کرتے ہوئے چلتے، نیز امراء وشہزادگان کی طرح اس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہوتے۔ غرض بشر ہوتے ہوئے بھی وہ فوق البشر ہوتا۔ حماقت اور جاہلیت کا کمال دیکھئے کہ فرعون خود تو ایک بشر ہونے کے باوجود معبود اور رب اعلیٰ ہو سکتا تھا، حالانکہ اس کے جلو میں کوئی ایک بھی فرشتہ نہیں تھا، مگر حضرت موسیٰؑ اللہ کے رسول اور ایلچی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ ان کے ارد گرد فرشتوں کا کوئی جھرمٹ نہیں دکھائی دیتا تھا! فرعون کی یہ باتیں، خصوصاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہی اہل مصر کا الٰہ و رب ہے اور اس کا یہ سوال کہ رب العالمین کیا چیز ہے، جس قدر بودا اور عقل وفہم سے بعید تھا اسے ایک معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی بداہتہً محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ

اس کے اس احمقانہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے دو ہی ایک جملے کہے تھے کہ اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی، اور پھر اس کے بجائے کہ وہ اپنی اوقات پر نظر ڈال کر سیدھی طرح حق بات کو مان لیتا، اپنے موقف کی حمایت میں وہی لاجواب دلیل پیش کردی جسے ہر جبار عنید معقولیت کے میدان میں شکست کھاجانے کے بعد پیش کیا کرتا ہے۔ اس نے کہا "موسیٰ! اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا رب بنایا تو میں یقیناً تجھے قید کردوں گا" (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ۔ شعراء۔ ۲۹)

یہ پرانے زمانوں کی چند تاریخی شہادتیں ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا پرستی، آخرت اندیشی، نیکی، تقویٰ اور حسنِ خلق کے پاکیزہ تصورات کو، جو عقل سلیم کے بدیہی مسلمات اور روحِ انسانی کی مرغوب غذا ہیں، آدمی لبسا اوقات کتنی ناگواری اور ترش روئی کے ساتھ ٹھکرا دیا کرتا ہے۔ پھر ان شہادتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عاقبت دشمن حرکت کی وجہ ہر دور میں، ہر جگہ اور ہر قوم کے ہاں ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ انسان کی خود فراموشی، ذہنی پستی، فکری کجی، عقلی فساد، باپ دادا کی اندھی تقلید، نفس پرستی اور جاہلی حمیت — یہی وہ نامبارک حجابات ہیں جو حق کے لئے نفوذ کی راہ کو بند رکھتے، اور آدمی کو اس سے بے گانۂ محض بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ انسان اُس حق سے، جس کے ساتھ اس کی اصل فطرت کو وہی تعلق ہے جو تعلق مقناطیس سے صاف لوہے کو ہوتا ہے، یوں اظہارِ بیزاری کرتا۔ چنانچہ ان افراد کا حال بالکل دوسرا رہا جو اگرچہ جاہلیت کے اندھیرے میں گم پڑے تھے، مگر ان کے دلوں میں ابھی زندگی باقی تھی اور ان کی فطرت قبولِ کی صلاحیت سے ہنوز محروم نہیں ہوئی تھی۔ جب حق کی روشنی پھیلی تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ جس کے بعد نہ جاہلی معاشرے کا بندھن انھیں باندھ کر رکھ سکا اور نہ ان کے ذاتی مصالح و مفادات ان کے پاؤں کی بیڑی بن سکے۔ حتیٰ کہ وقت کا اقتدار بھی انھیں اپنے فیصلے سے باز نہ رکھ سکا۔ معاشرے نے جب دباؤ ڈالا تو ان کا

جواب تھا "وَمَا لِیَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ" یٰس ۲۲۔ (آخر میں اس خدا کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اسی کے پاس تم سب کو بھی لوٹ کر جانا ہے؟) اور جب ظالم اقتدار نے سولی پر چڑھا دینے کی دھمکی دی تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "فَاقۡضِ مَآ اَنۡتَ قَاضٍ" طہٰ ۷۲ (جو کچھ تجھے کرنا ہو کرلے) انبیاء علیہم السلام کے سارے جتن کے باوجود اور بیّن سے بیّن آیات دیکھ لینے کے بعد بھی جاہلیت کے بدستور گرویدہ بنے رہے تو صرف وہ بدبخت جن کے اندر ذوقِ حق طلبی کا شائبہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا اور جنھوں نے انسانیت اور نفسانیت کو ہم معنی سمجھ رکھا تھا۔

بَدَءَ الۡاِسۡلَامُ غَرِیۡبًا

ساتویں صدی عیسوی کا آغاز تھا کہ ہدایتِ ربانی کا آخری نزول شروع ہوا، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیامبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے۔ وقت کے پردوں پر دعوتِ حق کے سلسلے میں وہی مناظر پھر ابھرنے لگے جو ایسے مواقع پر ہمیشہ ابھرتے رہے ہیں۔ چونکہ آپؐ کی نبوت نہ صرف یہ کہ دائمی تھی بلکہ عالمی بھی تھی، اس لئے اب کی بار اسلام اور جاہلیت کا ٹکراؤ بھی غیر معمولی حد تک سخت اور وسیع رہا۔ اگرچہ دنیا اپنی ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے اب سنِ رُشد کو پہنچ رہی تھی مگر حق سے اس کی بے رغبتی اور باطل سے ذوقِ وابستگی میں کوئی فرق نہ ہونے پایا تھا۔ اس لئے آپ کی دعوت کا بلند ہونا تھا کہ ٹھیک وہی طوفان اٹھ کھڑا ہوا جو انبیائی دعوتوں کے خلاف اٹھتا رہا ہے۔ حق کی تردید کے لئے جاہلیت اپنی بیاضِ استدلال کھول کر بیٹھ گئی اور آپؐ کی نبوت کے خلاف یہ دلیل پڑھ کر سنا دی۔

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا — کیا اللہ نے ایک بشر کو اپنا فرستادہ بنایا ہے؟ (بنی اسرائیل ۹۴)

اور:-

عَجِبُوۡٓا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ — اس بات پر وہ متعجب ہو رہے ہیں کہ انہی

مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُوْنَ — کے اندر سے ایک خبردار کرنے والا ان
هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ — کے پاس آیا ہے چنانچہ ان منکروں
(ق۔۲) — نے کہا کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

جہاں کسی پر شبہ ہوا کہ یہ حضورؐ کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے قوم کے بڑوں نے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا:۔

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا — تم تو ایک آسیب زدہ کے پیرو
مَّسْحُوْرًا (بنی اسرائیل۔۴۷) — بنا چاہتے ہو

اور جب آپؐ کی زبان سے قرآن سنتے تو اس پر توجہ کرنے کے بجائے تیز تیز نگاہوں سے آپؐ کو اس طرح گھورنے لگتے گویا آپ کے قدم پھسلائے بغیر نہ رہیں گے (اِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ ۔قلم۔۵۱) اور کہتے یہ تو نرا دیوانہ ہے (اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ ۔ایضاً) توحیدؐ کے خلاف یہ 'دلیل' پیش کی گئی:۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا — کیا اس شخص نے سارے معبودوں کی
وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ — جگہ ایک ہی معبود بنا ڈالا ہے؟ یہ تو بڑی
عُجَابٌ (ص۔۵) — عجیب چیز ہے۔

اور پھر عملی رویہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں کان میں پڑتے ہی منہ موڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے (وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ نُفُوْرًا ۔بنی اسرائیل۔۴۶)

آخرتؐ کی بات سنتے ہی آپؐ کو ایک انوکھا اور حیرت انگیز تماشہ قرار دے کر ایک دوسرے سے کہنے لگا:۔

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ — کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کو بتلائیں جو
يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ — خبر دیتا ہے کہ جب تم لوگ گل سڑ کر
مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ — ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سرِ نو پیدا کئے
جَدِيْدٍ (سبا۔۷) — جاؤ گے؟

اور بار بار اس کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ کبھی سر ہلا ہلا کر کہا جاتا "آخر وہ کب برپا ہوگی"؟ (مَتٰی هُوَ۔ بنی اسرائیل۔ ۵۱) کبھی پوچھا جاتا "وہ کب آکر لنگر انداز ہوگی"؟ (اَیَّانَ مُرْسٰهَا نازعات۔ ۴۲) غرض ان ماضی پرستوں، حال کے شیدائیوں اور مستقبل سے غافلوں کے نزدیک دعوتِ حق کی بنیادوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو بداہتہً غلط نہ ہوتی اور جو قابلِ تعجب ہی نہیں لائقِ استہزا بھی نہ ٹھہرتی اور جس پر لمحہ بھر بھی ٹھہر کر غور کیا جا سکتا۔ ہر بنیاد ایک عجوبہ اور اس کی ہر دلیل دیوانے کی بڑ تھی۔ آپؐ کے نبی ہونے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزا، توحید کے عقیدے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزا، آخرت کی بات پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزا۔ اور جب اس دین کی ساری بنیادیں محلِ تعجب اور لائقِ استہزا ٹھہرا دی گئیں تو ان بنیادوں پر تشکیل پانے والے پورے نظامِ ہدایت کا ایک ایک جزو ان کے لئے قدرتی طور پر ناقابلِ فہم ہونا چاہئے تھا، اور جیسا کہ آگے چل کر آپ تفصیل سے پڑھیں گے، فی الواقع ایسا ہی ہوا بھی۔ حضورؐ کی اور آپؐ کے اصحابؓ کی مسلسل کوششوں اور تفہیموں کے باوجود نہ تو اس دین کا تصور ہی انھیں اپیل کر سکا، نہ اس کے معیارِ خیر و شر سے وہ مانوس ہو سکے، نہ اس کی اخلاقی قدروں کے رمز شناس بن سکے اور نہ اس کے احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں ان کی سمجھ میں آسکیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضورؐ ان کی نظر میں اس دنیا کی مخلوق تھے ہی نہیں نہ آپؐ کی کوئی بات انسانی عقل کے لئے قابلِ فہم تھی۔ آپؐ کے لائے ہوئے دین کے مطلوبہ ذہنی سانچے سے رائج الوقت اندازِ فکر و نظر کی بے گانگی کی انتہا یہ تھی کہ جاہلیت کے اندھے پرستاروں کا معاملہ تو الگ رہا، اُن پیروانِ حق کو بھی جو جاہلیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکل آئے تھے اور جنھیں توحید، آخرت، رسالت، قرآن اور اسلام پر پورا پورا شرحِ صدر حاصل ہو گیا تھا۔ اس دین کے تفصیلی تقاضوں کو ہضم کر لینے میں قدم قدم پر مشکلات پیش آتی رہیں، اور اس کی فکر کی بے نظیر بلندیوں کے سامنے وہ بھی بار بار ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے رہے، اور برسوں کی تربیتی کوششوں کے بعد ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذہنوں کو پوری

طرح صاف کر سکے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے یہ وہ حقائق ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تین لفظوں کے ایک مختصر سے بلیغ جملے میں یوں بیان فرمایا ہے :۔

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْباً اسلام کا آغاز ایسی حالت میں ہوا تھا
(مسلم، جلد اول، باب ان الاسلام بدأ غریبا) کہ وہ (دنیا کے لئے) 'غریب' تھا۔

'غریب' کے معنی عربی زبان میں اس معنی سے بہت کچھ مختلف ہیں جو اس لفظ کے اردو زبان میں ہیں۔ اردو میں غریب کے عام اور مشہور معنی مفلس اور نادار کے ہیں، اور کبھی کبھی 'مسافر' کے معنی میں بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کے معنی مفلس اور نادار کے تو بالکل نہیں ہیں البتہ مسافر کے ضرور ہیں، مگر یہ معنی بھی فی الواقع مجازی ہیں حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقی معنی اس لفظ کے نرالے، بیگانے اور اجنبی و ناما نوس کے ہیں۔ اور یہی اصل معنی اس ارشادِ نبوی میں مراد ہیں۔ 'مسافر' کے معنی اس لئے مراد نہیں ہو سکتے کہ ایسی شکل میں نہ تو اس ارشاد کے اندر کوئی خاص معنویت پیدا ہو سکتی ہے نہ ادب کا ذوق ہی اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ پھر 'غریب' کے معنی اگر مسافر کے ہوتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک اجنبی ماحول میں ہوتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اس سے کوئی یگانگی، کوئی انس اور کوئی جان پہچان نہیں ہوتی۔ لیکن اصل اجنبیت اور بے گانگی شکل صورت، وضع قطع اور وطنی تعلق کی نہیں بلکہ افکار و نظریات، پسند و ناپسند اور مذاق و مزاج کی ہوتی ہے۔ ایک آدمی اپنے ہم وطنوں اور خونی رشتہ رکھنے والوں کے اندر رہتے ہوئے بھی بیگانہ سے بے گانہ تر ہو سکتا ہے اگر اس کا ذہن ان کے ذہن سے کوئی لگاؤ نہ رکھتا ہو اور اس کے افکار و تصورات ان سے بالکل مختلف ہوں۔ پس اسلام کے 'غریب' ہونے کا مطلب جس طرح یہ نہیں ہے کہ جب اس کی ابتداء ہوئی تھی اس وقت اس کے عملی معنی افلاس کے تھے اور اس کے ماننے والے سب کے سب مفلس تھے، اسی طرح یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کی ابتداء مسافرت یا خانہ بدوشی کی حالت میں ہوئی تھی، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جب وہ آیا تو اپنی خالص

عقلیت اور بے آمیز فطریت، اپنے عقائد اور تصورات، اور اپنی اقدار و مرضیات کے اعتبار سے اس دنیا کے لئے بالکل نرالا، سرتاسر اجنبی اور یکسر بیگانہ تھا جو نفسانیت، مادیت، فکر و نظر کی پستی، عقلی فساد، خود ساختہ رسوم اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے شیدائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک بات سے لوگوں کو وحشت ہو رہی تھی، ہر چیز ان کو اوپری اور ناقابل فہم، عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے ٹیڑھے اور تنگ دماغوں میں اس ماورائی، وسیع بلند اور پاکیزہ نظام ہدایت کا تصور کسی طرح سماتا ہی نہ تھا جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ جس طرح گول خانے میں چوکھٹی چیز گھس نہیں پاتی اسی طرح ان کے اوندھے ذہنوں میں دعوتِ حق کی باتیں اتر نہیں پاتی تھیں، اور جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو نیم کے پتوں کی کڑواہٹ محسوس نہیں ہو پاتی اسی طرح ان جاہلیت کے ڈسے ہوؤں کی عقل بھی کفر، شرک، فسق، مادیت، نفسانیت اور بد طینتی کی تلخی کا احساس کھو بیٹھی تھی۔

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے تازہ انگریزی کتابچے۔

(1) ISLAM — THE UNIVERSAL TRUTH 3/-

(2) ISLAM AND THE UNITY OF MAN KIND 3/-

By. Maulana Syed Jalaluddin Umri.

(3) PITFALLS ON THE PATH OF ISLAMIC MOVEMENT 4/-

(4) HOW TO STUDY ISLAM? 3/-

By Maulana Sadruddin Islahi

یہ کتابچے ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اسلام میں مظلوم کے حقوق

سید جلال الدین عمری

کسی شخص پر ظلم وزیادتی ہو تو اسے یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اس نقصان کی تلافی کا مطالبہ کرے جو اسے پہونچا ہے ورنہ معاشرہ میں کم زوروں کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جس کسی کے ہاتھ میں طاقت ہوگی وہ جب چاہے گا ان کے حقوق پر دست درازی کرے گا اور اسے کسی جوابی اقدام کا خطرہ نہ ہوگا۔ اسلام نے مظلوم کو وہ سارے حقوق دیئے ہیں جن کے ذریعہ وہ ظلم کا مقابلہ کرسکتا، ظالم کو بے نقاب کرسکتا اور اس کے خلاف چارہ جوئی کرسکتا ہے۔ یہاں اس سلسلہ کے بعض حقوق کا ذکر کیا جارہا ہے۔

مظلوم ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے

اگر کسی پر ظلم وستم ہو تو اسے ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا فطری حق ہے۔ لیکن معاشرہ کے کم زور افراد اور طبقات بالعموم اس حق سے محروم ہی رہے ہیں۔ انھیں اس قدر دبایا اور کچلا گیا کہ وہ بڑے سے بڑے ظلم اور بربریت کے خلاف بھی دم مارنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ وہ اپنے حقوق کے مالک نہ تھے بلکہ ان کے حقوق ان جابروں اور ظالموں کے ہاتھوں میں تھے جو لطف ومحبت اور ہمدردی سے ناآشنا تھے۔ وہ جب چاہتے ان بے نواؤں کے حقوق روندتے اور پامال کرتے اور انہیں حرف شکایت تک زبان پر لانے کی

اجازت نہ تھی۔ اسلام نے مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا اور اعلان کیا:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ	اللہ کو پسند نہیں کہ کسی کی بری بات
بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا	کا ذکر کیا جائے۔ لیکن جس شخص پر ظلم
مَنْ ظُلِمَ وَکَانَ اللّٰہُ	ہو (وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے) اور
سَمِیْعًا عَلِیْمًا۔ (النساء:۱۴۸)	اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

کسی غلط اور گندی بات کا زبان سے نکالنا اور اس کا چرچا کرنا سخت ناپسندیدہ ہے اس لئے کہ اس سے اسے فروغ ملتا ہے۔ جو گندگی ایک جگہ ہوتی ہے وہ دس جگہ پھیلتی ہے۔ البتہ کسی پر ظلم ہو تو اسے اس کے اظہار و اعلان کا حق ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم بے نقاب ہوگا اور سوسائٹی اس کے شر سے محفوظ رہے گی تو دوسری طرف مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اور اس پر ہونے والے ظلم و ناانصافی کا مداوا ہوگا۔

ظلم و زیادتی اور بدسلوکی کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ آدمی کے ساتھ جس قسم کی بھی زیادتی ہو کیا وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے یا بعض مخصوص زیادتیوں ہی کے اظہار کی اسے اجازت ہے؟ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مہمان بنے اور وہ اس کی ٹھیک سے مہمانی نہ کرے تو وہ اس کی شکایت کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے ایک حقِ ضیف بھی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی بھی اجنبی جگہ پہونچ جائے تو بھوکا رہنے پر مجبور نہ ہو۔ وہاں وہ اپنے کسی بھی مسلمان بھائی کا مہمان بن سکتا ہے۔ حقِ ضیف کے سلسلہ میں بعض روایات بھی آئی ہیں جن کی بنیاد پر امام احمدؒ وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۱/۵۷۱

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں۔ آیت کا مطلب ہے کہ آدمی پر زیادتی ہو تو وہ بد دعا کرسکتا ہے۔ یہ درحقیقت مثالیں ہیں جن کے ذریعہ آیت کے مفہوم کو سمجھایا گیا ہے۔ ورنہ آیت میں مظلوم کو بغیر کسی تخصیص کے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے اظہار کی بلکہ انتقام کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ سدّی کہتے ہیں:۔

ان اللہ لا یحب الجہر	بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند
بالسوء من احد من	کرتا ہے کہ انسانوں میں سے کوئی بھی
الخلق ولکن یقول من	برائی کا اظہار کرے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا
ظلم فانتصر بمثل ما	ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اپنے
ظلم فلیس علیہ	ظلم کے جواب میں انتقام لے تو اس
جناح	پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے ان سب اقوال کو نقل کرنے کے بعد آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے: "اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ علانیہ کسی کی برائی کی جائے البتہ جس شخص پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اس کا ذکر کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی نے مہمان کا حق بالکل نہیں ادا کیا یا ٹھیک سے نہیں ادا کیا یا کسی کی جان و مال پر اس نے زیادتی کی۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مظلوم اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اگر وہ آواز کے ساتھ دعا کرے تو یہ بھی ایک طرح کا اظہار ہی ہے[1]۔

مفسر خازن لکھتے ہیں "علماء نے کہا ہے کہ لوگوں کے خفیہ حالات کو دوسروں پر ظاہر کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے لوگ غیبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور خود وہ شخص شک و شبہ میں گرفتار رہتا ہے۔ البتہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس طرح کہ فلاں نے اس کا مال چرایا یا غصب کیا ہے۔ اگر کوئی اسے برا بھلا

---

[1] تفسیر ابن جریر جزء ۶/۲-۴

کہے تو اسے اس کا جواب دینے کا بھی حق ہے۔[1]

جس شخص پر ظلم و زیادتی ہو تو اس پر یہ مزید ظلم ہوگا کہ اسے اس کے اظہار کی بھی اجازت نہ دی جائے۔ مظلوم کی زبان بند کرنے سے ظلم بے قید ہو جاتا ہے اور اسے پھلنے پھولنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اسلام مظلوم کو یہ حق دے کر کہ وہ ظلم کا برملا اظہار کر سکتا ہے اسے معاشرہ سے ختم کرنا چاہتا ہے۔

حق دار حق کا مطالبہ کر سکتا ہے

احادیث میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ حق دار اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسے اس حق سے نہ تو روکا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ اگر اپنے حق کے مطالبہ میں اس کی طرف سے شدت اور سختی کا مظاہرہ بھی ہو تو اسے برداشت کیا جانا چاہئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے (جو غالباً کافر تھا) اونٹ قرض لیا۔ اس نے شدت سے واپسی قرض کا مطالبہ کیا تو صحابہ کرامؓ نے اسے سخت جواب دینا چاہا آپؐ نے فرمایا:۔

دعوہ فان لصاحب	اسے چھوڑ دو اس لئے کہ جو حق دار ہے
الحق مقالا	اسے بولنے کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد حکم دیا کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دیا جائے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ جو اونٹ اس سے لیا گیا تھا اس سن و سال کا اونٹ تو اس وقت دستیاب نہیں ہے البتہ اس سے بہتر اونٹ موجود ہے۔ آپ نے فرمایا وہی اونٹ خرید کر اسے دے دو۔ تم میں بہتر انسان وہ ہے جو بہتر طریقے سے قرض کی ادائیگی کرے۔[2]

---

[1] تفسیر خازن ۱/۵۱۲۔ امام رازی نے اس تشریح کو اصم کی طرف منسوب کیا ہے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ۳/۳۴۶

[2] بخاری، کتاب الاستقراض، باب استقراض الابل۔ مسلم، کتاب المساقاۃ

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

ای صولۃ الطلب	وہ زور سے طلب کر سکتا اور قوت
وقوۃ الحجۃ لکن	سے بول سکتا ہے لیکن شریعت نے
مع مراعاۃ	جو ادب بتایا ہے اس کی رعایت
الادب المشروع [1]	کرتے ہوئے۔

مطلب یہ کہ شریعت کے قائم کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے حق دار پورے زور اور قوت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسی حدیث کے ذیل میں علامہ ابن الملک کہتے ہیں کہ حق دار کو اپنا حق نہ ملے تو صرف یہی نہیں کہ شکایت اور ڈانٹ ڈپٹ کی اسے اجازت ہوگی بلکہ وہ قانونی چارہ جوئی بھی کر سکتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں

المراد بالحق هنا الدين	یہاں حق سے مراد قرض ہے۔ یعنی
یعنی من کان علی	جس کا اپنے قرض دار پر حق ہو اور وہ
غریمہ حق فماطلہ	اس کے ساتھ ٹال مٹول کرے تو وہ
فلہ ان یشکوہ	اس کی شکایت کر سکتا ہے، حاکم
ویرافعہ الی الحاکم	تک اسے لے جا سکتا ہے اور اس
ویعاتب علیہ	کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکتا ہے۔
وھو المراد	حدیث میں جو 'مقال' کا لفظ آیا ہے
بالمقال [2]	اس کا یہی مطلب ہے۔

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے

ایک انسان دوسرے انسان کا حق ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی کرے یا اپنے

---

[1] فتح الباری ۳۶/۵ [2] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار ۱/ ۱۴۷

جائز حق سے زیادہ کا اس سے مطالبہ کرے تو اس پر ظلم کرتا ہے۔ اس پر اگر بندش نہ لگائی جائے تو ظلم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکتا ہے۔ اسلام اس رویہ کو غلط اور ناجائز ٹھہراتا اور اسے سختی سے روکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مطل الغنی ظلم فاذا اتبع احدکم علی ملیٍّ فلیتبع [1]	مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (اس کی ایک مسلمان سے توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے) جب تم میں سے کسی کو کسی مالدار کے پیچھے بھیجا جائے (قرض کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا جائے) تو وہ اس کے پیچھے جائے (حوالہ قبول کرلے)

حدیث میں 'مطل' کا جو لفظ آیا ہے اس کے معنی کسی حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول اور تاخیر کے ہیں۔ امام نووی قاضی عیاض وغیرہ کے حوالہ سے کہتے ہیں:

المطل منع قضاء ما استحق اداؤہ [2]	جس حق کا ادا کرنا ضروری ہو جائے اس کے ادا کرنے سے انکار کرنا

حافظ ابن حجر نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

تأخیر ما استحق اداؤہ بغیر عذر [3]	جس چیز کا ادا کرنا ضروری ہو جائے اس کے ادا کرنے میں بغیر کسی عذر کے تاخیر کرنا

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحب حیثیت ہے، اس کے لئے حقوق کی ادائیگی میں تاخیر نا روا ہے اس لئے کہ اس کی طرف سے تاخیر کی کوئی معقول وجہ نہیں

---

[1] بخاری، کتاب الاجارہ، باب الحوالہ الخ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم مطل الغنی، [2] شرح مسلم ۱۷/۲

[3] فتح الباری ۴/۳۱۲

ہو سکتی۔ حق کا ادا نہ کرنا ہی ظلم نہیں ہے بلکہ بلا وجہ اس میں ٹال مٹول بھی ظلم ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

اس حدیث کی رو سے کسی غنی اور تونگر شخص کا حق دار کو حق ادا نہ کرنا ظلم اور حرام ہے[۱]

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے والا فاسق ہے

جو شخص بغیر کسی عذر کے قرض یا کسی بھی حق کے ادا کرنے میں دانستہ تاخیر کرے علماء نے اسے فاسق کہا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

امام مالک کے تلامذہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے اور دوسرے لوگوں کے درمیان بھی کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ بھی قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے تو کیا اسے فاسق سمجھا جائے گا اور کسی معاملہ میں وہ شہادت دے تو قبول نہیں کی جائیگی یا اسے اس وقت فاسق سمجھا جائے گا جب کہ بار بار اس سے یہ حرکت سرزد ہو۔ شوافع کے مسلک کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسری صورت ہی میں اسے فاسق قرار دیا جائے[۲]

لیکن علامہ سبکی کہتے ہیں شوافع کے مسلک کا تقاضا بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو فاسق قرار دیا جائے اور اس کی شہادت قبول نہ کی جائے اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ مطالبہ کے باوجود کسی حق کا ادا نہ کرنا غصب ہے اور غصب گناہ کبیرہ ہے۔ پھر یہ کہ اسے حدیث میں ظلم کہا گیا ہے۔ یہ خود بھی اس کے گناہ کبیرہ ہونے کی دلیل ہے۔ گناہ کبیرہ کے بارے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی سے بار بار سرزد ہو تب ہی اسے فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے فاسق ہونے کا فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جب کہ یہ صاف اور صریح طور پر معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے ٹال مٹول کر رہا ہے[۳]

---

[۱] شرح مسلم ۲/۱۸ [۲] حوالہ سابق [۳] فتح الباری ۴/۳۱۳

ایک سوال یہ بھی ہے کہ حق کے محض واجب ہوجانے کے بعد اس کا ادا نہ کرنا فسق ہے یا اس کے لئے مطالبہ ضروری ہے؟ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں علماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن حدیث میں 'مطل' کا لفظ آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حق کا نہ ادا کرنا، فسق نہیں ہے بلکہ مطالبہ کے بعد بھی اس کا نہ ادا کرنا فسق ہے۔[1]

حق کے نہ ادا کرنے پر سزا دی جا سکتی ہے

کسی کا حقِ واجب قصداً ادا نہ کرنا اور اس میں ٹال مٹول کرنا صریح ظلم ہے۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں

واستدل بہ علی	اس سے ٹال مٹول کرنے والے کو پکڑے
ملازمۃ المماطل	رہنے، قرض کی ادائیگی کو اس کے لئے
والزامہ بدفع الدین	ضروری قرار دینے، ہر ممکن تدبیر سے
والتوصل الیہ	اس مقصد تک پہونچنے اور زبردستی
بکل طریق واخذہ	اس سے قرض واپس لینے پر استدلال
منہ قہرا[2]	کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں یہی بات صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ چنانچہ عمرو بن شریدؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَیُّ الواجد	جس کے پاس پیسہ موجود ہے وہ حق
یُحِلُّ عرضہ	کی ادائیگی سے منھ موڑتا ہے تو اس
وعقوبتہُ[3]	بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ اس کی عزت کا خیال نہ کیا جائے اور اسے سزا دی جائے

---

[1] فتح الباری ۴/۳۱۲ [2] حوالہ سابق

[3] ابوداؤد، کتاب القضاء، باب فی الدین ھل یحبس لہ، نسائی، کتاب البیوع باب مطل الغنی

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حقدار کا حق ادا نہ کرے اور اسے مارکھانے کی کوشش کرے تو اس کے ظلم وزیادتی کو دنیا کے سامنے کھولنا جائز ہوگا۔ اس سے اگر سوسائٹی میں اس کا وقار مجروح ہورہا ہے اور اس کی جھوٹی عزت پر حرف آرہا ہے تو اس میں کسی دوسرے کا قصور نہیں ہے۔ خود اس نے اپنی عزت کو نقصان پہونچایا ہے۔ یہی نہیں ریاست کو اس کے خلاف تعزیری کارروائی کا بھی حق ہے وہ اسے مناسب سزا دے سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مبارک اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

یحل عرضہ	وہ اپنی عزت کو حلال کرتا ہے، مطلب
یغلظ لہ وعقوبتہ	یہ کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی جائے گی اور
یحبس لہ [1]	اس کی سزا سے مراد یہ ہے کہ اسے قید کیا جائے گا۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جو شخص قرض ادا کرسکتا ہو اسے تادیب کے طور پر اور اس پر سختی کرنے کے لئے قید کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کردے [2]

نادار کا حکم

ان احادیث کی بنا پر کہا گیا ہے کہ کسی نادار شخص کی طرف سے حق کے ادا کرنے میں تاخیر ہو تو اسے ظلم نہیں کہا جاسکتا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت جس میں مالدار کے ٹال مٹول کو ظلم کہا گیا ہے اس کے ذیل میں امام نووی لکھتے ہیں:

اس سے از خود یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کوئی غریب اور نادار کسی کا حق نہیں ادا کرپا رہا ہے

---

[1] ابو داؤد حوالۂ سابق [2] نیل الاوطار ۳۶۱/۵

تو اسے ظلم یا حرام نہیں کہا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ معذور ہے۔ اسی طرح ایک صاحبِ حیثیت اس لئے تاخیر کر رہا ہے کہ بر وقت اس کے پاس رقم نہیں ہے یا اور کوئی (معقول) وجہ ہے تو اس کی تاخیر بھی جائز ہوگی۔[۱]

یہ بات حدیث سے مفہوم مخالف کے طور پر اخذ کی گئی ہے۔ بعض لوگ اس کے قائل نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں " انھوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جو شخص قرض ادا نہ کر سکے اسے ٹال مٹول کرنے والا کہا ہی نہیں جائے گا۔ اگر کوئی مالدار شخص بر وقت مال نہ ہونے کی وجہ سے کوئی حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو وہ بھی ظلم کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسے شخص کو زکوٰۃ میں فقراء کا جو حصہ ہے اس میں سے دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ غنی کے حکم میں ہو تو اسے زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔[۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا 'مفہوم مخالف' نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں جو وعید آئی ہے وہ غنی کے لئے ہے۔ جو غنی نہیں ہے اس کے لئے یہ وعید نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے امام نووی فرماتے ہیں۔ غنی وہ شخص ہے جو حقِ واجب بر وقت ادا کر سکتا ہو۔ جو اس حیثیت میں نہیں ہے اسے غنی نہیں کہا جائے گا۔[۳]

ان احادیث سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ جو شخص نادار اور مفلس ہے اسے قرض کے نہ ادا کرنے پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس حدیث سے امام مالک، امام شافعی اور جمہور کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص مفلس اور نادار ہے اسے قرض کے سلسلہ میں پکڑنا، قید کرنا اور اس سے مطالبہ کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ ادا کرنے کی حیثیت میں نہ ہو جائے۔[۴]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ کسی نادار سے مواخذہ کرنے

---

[۱] شرح مسلم ۱۸/۲ [۲] فتح الباری ۳۱۳/۴ [۳] شرح مسلم ۱۸/۲ [۴] شرح مسلم ۱۸/۲

کا مطلب یہ ہے کہ وہ ظالم ہے حالانکہ بظاہر حدیث بتاتی ہے کہ وہ ظالم نہیں ہے اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔ لیکن بعض علمار کے نزدیک قرض دار کو قید کیا جا سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ قرض خواہ اسے پکڑے بھی رہ سکتا ہے۔[1]

فقہار احناف نے مالی حقوق کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض حقوق تو وہ ہیں کہ اگر حاکم کے پاس ثابت ہو جائیں اور مدعی اس بات کا مطالبہ کرے کہ مدعیٰ علیہ کو قید کر دیا جائے تو حاکم پہلے مدعیٰ علیہ سے کہے گا کہ وہ حق ادا کر دے اگر وہ ادا نہ کرے تو اسے قید کر دے گا۔ جیسے کوئی شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور قیمت نہ ادا کرے یا عورت کا مہر (معجل) نہ دے یا کسی کی مالی ضمانت لے اور اسے پورا نہ کرے لیکن بعض حقوق وہ ہیں کہ اگر مدعیٰ علیہ یہ کہے کہ وہ نادار ہے اور حق ادا نہیں کر سکتا تو اسے اسی وقت قید کیا جائے گا جب کہ مدعی یہ ثابت کر دے کہ وہ حق ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جو صورتیں پہلے بیان ہوئی ہیں ان میں آدمی کا صاحب حیثیت ہونا از خود ظاہر ہے۔ اس لئے کہ خریدی ہوئی چیز اس کے پاس موجود ہے اسی سے اس کا غنی ہونا ثابت ہے۔ مہر اور کفالت کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے خود سے اسے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ادا بھی کر سکتا ہے۔ اسی میں قرض اور اجرت بھی داخل ہے۔[2]

کسی بھی حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول صحیح نہیں ہے

جس طرح قرض کے ادا کرنے میں ٹال مٹول ظلم ہے اسی طرح وہ سارے حقوق جو ایک آدمی کے دوسرے آدمی پر واجب ہوں ان کے پورا کرنے میں لیت و لعل اور تاخیر

---

[1] فتح الباری ۴/۳۱۳ [2] تفصیل کے لئے دیکھئے ہدایہ ۳/۱۳۶-۱۳۷ ردالمحتار مع درالمختار ۴/۳۳۸-۳۳۹

کرنا بھی ظلم ہی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

ویدخل فی المطل کل	'مطل' (جس سے منع کیا گیا ہے اس
من لزمہ حق	کے حکم) میں ہر وہ شخص داخل ہے
کالزوج لزوجتہ	جس پر کوئی حق لازم آئے۔ جیسے شوہر
والسید لعبدہ	پر بیوی کا، آقا پر غلام کا اور حاکم پر
والحاکم لرعیتہ	رعیت کا حق ہے۔ اس کے برعکس
وبالعکس [1]	بھی حق واجب ہوگا۔

قرض دار حوالہ قبول کرے

جو شخص مالدار ہے اور قرض ادا کر سکتا ہے۔ حدیث میں جہاں اسے قرض کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں قرض خواہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرض کے سلسلہ میں کسی صاحب حیثیت کا حوالہ دیا جائے تو اسے قبول کرے۔

واذا اتبع احدکم علی ملی فلیتبع

اگر قرض دار حوالہ دے کہ فلاں شخص سے قرض وصول کر لیا جائے تو امام نووی فرماتے ہیں جمہور کے نزدیک اس کا قبول کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ بعض لوگوں نے اسے صرف مباح قرار دیا ہے۔ داؤد ظاہری وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے [2]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں جمہور نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ ایک شاذ رائے یہ ہے کہ وہ مباح ہے۔ حنابلہ میں سے اکثر نے ابو ثور، ابن جریر اور اہل ظاہر نے اسے واجب کہا ہے [3]

فقہ حنفی کی رو سے حوالہ اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ قرض دار، قرض خواہ اور جس کا حوالہ

---

[1] فتح الباری ۴/۳۱۴ [2] شرح مسلم ۲/۱۸ [3] فتح الباری ۴/۳۱۲

دیا جارہا ہے تینوں کی رضامندی اس میں شامل ہو[1]۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک قرض خواہ کی رضامندی تو ضروری ہے لیکن جس کا حوالہ دیا جارہا ہے امام مالک فرماتے ہیں اس کی رضامندی ضروری نہیں ہے، الّا یہ کہ قرض خواہ کی اس سے کوئی عداوت اور دشمنی ہو۔ ایک روایت یہ ہے کہ امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جس کا حوالہ دیا جارہا ہے اس کی رضامندی ضروری ہے۔ فقہ حنبلی میں ہے کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اگر مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہے کہ رقم ادا کرسکتا ہے اور انکار اور ٹال مٹول کرنے والا نہیں ہے تو قرض خواہ کو لازماً حوالہ قبول کرنا ہوگا اس صورت میں قرض خواہ کی اور جس کا حوالہ دیا جارہا ہے رضامندی ضروری نہیں ہے[2]

اگر قرض خواہ نے حوالہ قبول کرلیا اور یہ شرط نہیں رکھی کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اسے صاحب حیثیت ہونا چاہئیے تو اب وہ امام لیث، امام شافعی، ابوعبید اور ابن المنذر وغیرہ کی رائے میں حوالہ دینے والے کی طرف قرض کے سلسلہ میں رجوع نہیں کرسکتا چاہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ٹال مٹول کرے یا اس کے افلاس، موت یا اور کسی وجہ سے وہ اس سے قرض وصول نہ کرسکے۔

امام احمد سے جو روایات پہونچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا وہ مفلس تھا اور قرض خواہ اس سے واقف نہیں تھا تو اسے حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کا حق ہوگا۔ وہ چاہے تو اس کے افلاس کے باوجود اس حوالہ کو قبول بھی کرسکتا ہے، یہی رائے حنابلہ میں سے ایک جماعت کی ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مفلس ہونا ایک عیب ہے۔ اس وجہ سے قرض دار کو اس کا حق ہے کہ اس حوالہ کو رد کردے۔ قاضی شریح اور امام نخعی فرماتے ہیں کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اگر مفلس ہوجائے یا انتقال کرجائے تو جس نے

---

[1] ہدایہ ۳/۱۲۹ [2] المغنی ۴/۵۸۴

حوالہ دیا ہے اس کی طرف رجوع کا حق ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں قرض خواہ دو حالتوں میں حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا افلاس کی حالت میں انتقال ہو جائے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ حاکم کے سامنے قسم کھا کر اس حوالہ ہی سے انکار کر دے اور حوالہ دینے اور قبول کرنے والے کے پاس کوئی شہادت نہ ہو۔ امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں کے علاوہ وہ اس وقت بھی رجوع کر سکتا ہے جب کہ حاکم اس شخص کے افلاس کا فیصلہ کر دے جس کا حوالہ دیا گیا ہے[1]

حوالہ کے موضوع پر ہمارے فقہا نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں بعض موٹی موٹی اور ضروری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث کا اصل منشا یہ ہے کہ قرض دار کی طرف سے قرض خواہ کو اپنا قرض وصول کرنے کی کوئی معقول صورت تجویز کی جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیئے ـــــ کسی صاحب حیثیت آدمی کا حوالہ بھی اسی طرح کی ایک صورت ہے۔ خواہ مخواہ کسی ایسی صورت پر اصرار اسے نہیں کرنا چاہیئے جس سے قرض دار زحمت اور دشواری محسوس کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض دار کے اندر اگر قرض کے ادا کرنے کا اور قرض خواہ کے اندر اسے پریشان نہ کرنے کا جذبہ موجود ہو تو قرض کی وجہ سے بعض اوقات معاملات میں جو الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ از خود ختم ہوتی چلی جائیں گی اور قرض تعلقات کی خرابی کا سبب نہیں بنے گا۔

---

[1] المغنی ۴/۵۸۱ - ہدایہ ۳/۱۲۹-۱۳۰

مسلمان خواتین کی دعوتی ذمہ داریاں سید جلال الدین عمری
عورت اور مرد تہذیب کے معمار ہیں۔ دین کی راہ میں میاں بیوی کا تعاون مطلوب ہے۔ عورت کی دعوتی جدوجہد کا میدان۔ داعی خواتین کے لئے مطلوبہ صفات۔ یہ ہیں اس رسالے کے بعض مباحث۔
قیمت : 1/50 پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی ۶

رویت ہلال کا مسئلہ
(۲)

الشیخ عبداللہ بن محمد بن حمید ــــــــ مترجم: مولانا محمد امین الاثری

صاحب مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح نے کہا ہے کہ زیلعی کا قول تسلیم کرنا ضروری ہے ورنہ عید کا ستائیسویں یا اٹھائیسویں یا اکتیسویں یا بتیسویں دن ہونا لازم آئے گا۔ اس لئے قسطنطنیہ میں چاند ہم سے دو دن پہلے دکھائی دیتا ہے، پس جب ہم نے اپنے چاند کی رویت کے اعتبار سے روزہ رکھا اور پھر ہمیں قسطنطنیہ کے رویت کی خبر پہنچی تو عید کی تقدیم یا تاخیر لازم آئے گی۔ قسطنطنیہ کے کسی آدمی نے روزہ رکھا اور وہ ہمارے پاس آیا تو عید سے قبل پہونچے گا۔ اور مرعاۃ المفاتیح میں ہے کہ حنفیہ، مالکیہ اور عام شافعیہ کے محققین نے کہا ہے کہ دو شہروں میں اگر ایسی قریبی مسافت ہے جس سے مطالع مختلف نہیں ہوتے مثلاً بغداد اور بصرہ تو ان دونوں شہروں کے رہنے والوں پر ان میں سے کسی ایک کی رویت پر روزہ رکھنا لازم ہوگا۔ اور اگر ان دونوں شہروں میں اتنی دوری ہے جیسے عراق اور حجاز تو ہر ایک شہر والوں پر اپنے اپنے شہر کی رویت پر عمل کرنا ہوگا۔

شارح ترمذی عبدالرحمن مبارک پوری فرماتے ہیں: "جن شہروں کے مطالع میں اختلاف نہیں ہے ان میں سے ایک کی روایت دوسرے کے لئے لازماً تسلیم کی جائے گی" ایک روایت میں یہی قول ابوحنیفہ کا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ حکم ان شہروں کے لئے ہے جن میں قریب کی مسافت ہو اور مطالع کا فرق نہ ہو۔ ورنہ دونوں شہروں میں سے

ایک کا حکم دوسرے پر لازم نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ شہروں کے مطالع زیادہ مسافت کی وجہ سے مختلف ہوجاتے ہیں۔ اور شہر والوں میں انہی کے مطالع کا اعتبار ہوگا دوسرے کا نہیں جس طرح سورج کا مغرب مختلف ہوتا ہے اسی طرح ہر شہر میں اس کے مغرب کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی بات شیخ مرتضیٰ زبیدی نے بھی احیاء العلوم کی شرح میں لکھی ہے فرماتے ہیں کہ مطالع مختلف ہوتے ہیں دو شہروں میں سے کسی ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کے لئے کبھی مستلزم ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اس لئے کہ مشرقی شہروں میں رات غربی شہروں کے مقابلہ میں پہلے ہوجاتی ہے۔ اور جب مطلع متحد ہو تو ان میں سے کسی ایک کی رویت دوسرے کے لئے مستلزم ہے۔ اور جب مطلع مختلف ہو تو مشرق میں رویت ہوگی تو مغرب میں بھی ہوگی۔ لیکن اگر مغرب میں رویت ہوگی تو مشرق میں رویت ضروری نہیں ہے۔ اور ابن عابدین نے اپنے رسالہ (تنبیہ الغافل والوسنان علی احکام ھلال رمضان) میں تحریر فرمایا ہے کہ شہروں اور ملکوں کے اختلاف سے چاند کے مطالع میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک شہر میں سورج نکل آتا ہے اور دوسرے شہروں میں ابھی رات ہوتی ہے۔ جس کو کتب ہئیت میں مدلل بیان کیا گیا ہے اور اس کا مشاہدہ بھی ہے۔ محقق ابن حجر کے فتاویٰ میں علامہ سبکی اور اسنوی کی تصریح موجود ہے کہ جب مطالع مختلف ہوں تو ایک شہر کی طرح رویت کبھی دوسرے شہر میں بھی ہوسکتی ہے اس لئے کہ مشرقی شہروں میں مغربی شہروں کے اعتبار سے رات پہلے ہوتی ہے۔ پس اس اختلاف کی وجہ سے شرقی شہروں میں چاند دکھائی دے گا تو غربی شہروں میں بھی نظر آئے گا مگر غربی شہروں میں نظر آئے گا تو شرقی شہروں میں دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن اتحاد مطلع کے وقت ان میں سے کسی ایک میں دکھائی دے گا تو دوسرے میں بھی نظر آئے گا۔ اس وجہ سے علماء کی ایک جماعت کا فتویٰ ہے کہ دو بھائیوں میں سے ایک مشرق میں رہتا ہے اور دوسرا مغرب میں اگر دونوں کی ایک ہی دن بوقت زوال موت ہوجائے تو مشرق میں رہنے والے بھائی کی موت پہلے ہونے کی وجہ سے مغرب میں رہنے والا بھائی اس کا وارث ہوگا

جب یہ بات اوقات کے بارے میں ثابت ہے تو یہی بات چاند کے بارے میں بھی لازم آئے گی۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ مشرق میں ہلال کبھی سورج کے قریب ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں اسے چھپا لیتی ہیں اور مغرب میں جب دیر سے سورج ڈوبتا ہے تو ہلال اس سے دور ہوتا ہے اس لئے دکھائی بھی دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ چاند کی علیحدگی سورج کی شعاع سے ملکوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مشرق میں جب آفتاب ڈھلے گا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مغرب میں بھی ڈھل جائے۔ اور یہی حال فجر کے طلوع اور آفتاب کے غروب کا بھی ہے۔ بلکہ جب آفتاب ایک درجہ حرکت کرے گا تو کچھ لوگوں کے لئے فجر طلوع ہوگی، اور کچھ لوگوں کے نزدیک طلوع آفتاب ہوگا، اور کہیں غروب ہوگا اور کہیں نصف رات ہوگی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابو موسیٰ ضریر فقیہ صاحب مختصر اسکندریہ پہونچے تو ان سے پوچھا گیا کہ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو سورج غروب ہو جانے کے بعد اسکندریہ کے منارہ پر چڑھا تو اسے دیر تک سورج نظر آتا رہا کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ افطار کرے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ اس کے لئے افطار جائز نہیں ہے، اور شہر والوں کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس حالت کے مطابق عمل کرے گا جس میں وہ ہے۔ شیخ نجیب مطیعی نے اپنے رسالہ (ارشاد اہل الملۃ الی اثبات الاہلۃ) میں یوں لکھا ہے کہ علماء میں سے کسی عالم کو مطالع کے اختلاف میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو مشاہدہ سے ثابت ہے اور اس میں شریعت بھی عقل کے موافق ہے اور ہمیشہ عقل اور شریعت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی ہی ہیں، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ شارع نے بہت سے احکام کی بنیاد ہی مطالع کے اختلاف پر رکھی ہے چنانچہ نماز کے اوقات کا اختلاف اس پر مبنی ہے۔ حج کی تعیین میں اہل مکہ کے مطلع کا اعتبار ہے۔ وراثت میں بھی موت کی تقدیم و تاخیر کا اثر پڑتا ہے اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں اسی پر مبنی ہیں اور یہ سب متفق علیہ ہیں۔ اس کے بعد رمضان و شوال کے چاند کی رویت کی رو سے اعتبار و عدم اعتبار اور روزہ کے وجوب و افطار میں

لوگوں کا اختلاف پایا جاتا ہے مطالع کا اختلاف ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے وقتوں میں جو فرق واقع ہوتا ہے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جن مقامات پر دو یا تین مہینے برابر سورج نکلا رہتا ہے اور جسے وہاں کے لوگ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو بھی شخص وہاں جائے گا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اور اسی طرح یہ بھی بداہتہً معلوم ہے کہ قطب کی جہت میں رہنے والوں کے لئے چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے تو کیا ممکن ہے کہ اہل مصر جب غروب آفتاب کے وقت رمضان کا چاند دیکھیں تو قطب کے باشندوں کو بھی اہل مصر کی رویت پر روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے؟ اسی طرح ہمارے اور امریکہ والوں کے درمیان وقفوں میں کھلا ہوا فرق اور تخالف ہے تو کیا انھیں بھی مصر والوں کی رویت ہلال پر روزہ رکھنے کی تکلیف دینا درست اور بجا ہے؟ جب کہ یہ وقت ان کے نزدیک طلوع فجر یا طلوع آفتاب کا ہے۔ الغرض مطالع کا عدم اعتبار اور انکار عقل و نقل کے خلاف ہے۔

یہ ہیں علمائے حنفیہ کی تصریحات جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اختلاف مطالع کے قائل ہیں۔ یعنی جب ایک شہر میں رویت ہوگی تو دوسرے شہر میں رویت کا ہونا ضروری اور لازمی نہیں ہے الا یہ کہ دونوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر چاند مغرب میں دیکھا گیا مثلاً فارس والوں نے چاند دیکھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مشرق مثلاً مکہ والوں کو بھی چاند دکھائی دے۔ اس لئے کہ سورج جب ان کے پاس سے گذرا تو اس کی شعاعوں کی وجہ سے چاند نظر نہیں آرہا تھا اس لئے اس وقت اس کی رویت ان کے لئے ممکن نہیں تھی۔ اور جب سورج مغرب کی طرف چلے گا تو چاند اس کی شعاعوں کے دائرہ سے نکل آئے گا اس لئے اس وقت اس کی رویت ممکن ہوگی اور غربی جانب سورج جتنا بڑھے گا چاند اس سے اتنا ہی دور ہو جائے گا اور اس کی روشنی بھی بڑھ جائے گی اور وہ خوب نمایاں بھی ہوگا۔ اس کے برعکس نہیں ہوگا۔ لہٰذا مثال کے طور پر جب چاند مکہ مکرمہ میں دکھائی دے تو مغرب میں بھی ضرور نظر آئے گا۔ بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔

ہلال کی وجہ تسمیہ اہل عرب ہلال کو ہلال اس وقت کہتے ہیں جب وہ خوب روشن اور ظاہر ہو اور چونکہ اس کے دکھائی دینے پر لوگ آواز بلند کرتے ہیں اس لئے اس کو ہلال کہا جاتا ہے۔ اور یہ اہل عرب کے قول استھل الصبی سے ماخوذ ہے یا اھلال بالحج (بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا) سے یا چاند دیکھ کر لوگ چاند چاند کہہ کر آواز بلند کرتے ہیں۔ اس لئے اسے ہلال کہتے ہیں۔ اور کبھی ہلال کا لفظ مہینہ پر بھی بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے اھل الھلال واستھل یعنی نیا چاند نظر آیا۔ اور اھللناہ واستھللناہ یعنی ہم نے نیا چاند دیکھا۔ عام اہل لغت کا یہی قول ہے اور شمر نے کہا استھل الھلال بھی کہا جاتا ہے۔ اور شاعر کا درج ذیل شعر ثبوت میں پیش کیا ہے ؎ وشھر مستھل بعد شھر - وحول بعدہ حول جدید یعنی نیا مہینہ مہینہ کے بعد آتا ہے اور سال کے بعد نیا سال آتا ہے۔ اور استھل بمعنی تبلین بھی آتا ہے (یعنی روشن اور ظاہر) اور اہل نہیں کہا جاتا، اور اھللناہ عن لیلۃ کذا بھی بولا جاتا ہے۔ (بحر محیط) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ ہلال، ظہور اور رفع صوت سے ماخوذ ہے پس اگر اس کا طلوع آسمان سے زمین پر نظر نہ آئے تو ظاہر اور باطن میں طلوع کا حکم نہیں ہوگا عرب کہتے ہیں اھللنا الھلال واستھللناہ یعنی ہم نے نیا چاند دیکھا یہ آدمیوں کا عمل ہے، پس ہلال اس وقت ہلال ہوگا جب دکھائی دے۔ جب ایک اور دو آدمیوں نے چاند دیکھا اور انھوں نے اس کی خبر نہیں دی تو وہ ہلال نہیں ہے اور اس سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوگا۔ جب یہ دونوں شخص خبر دیں تو وہ ہلال ہے اس لئے کہ اس خبر کے ساتھ ان کی آواز بلند ہوئی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہلال اس چیز کا نام ہے جو ظاہر اور روشن ہو۔ ظہور سے قبل وہ ہلال نہیں ہے پس اس بنا پر اہل مشرق پر روزہ اور افطار مغرب والوں کی رویت پر لازم نہیں آئے گا۔ کیوں کہ مشرق والوں پر ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہلال ہی نہیں ہے۔

محققین مالکیہ کے اقوال ابن عبد البر نے تمہید میں کہا ہے کہ "اس بات پر علماء کا اجماع ہوگیا ہے کہ جو شہر ایک دوسرے سے دور واقع ہیں

ان کی رویت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ جیسے خراسان اندلس سے دور ہے اس لئے کہ ہر شہر کے لئے ایک خاص حکم ہے جو اسی شہر کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے پس جو شہر آپس میں قریب ہیں ان کی رویت ایک دوسرے کے لئے معتبر ہوگی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ خبر خواہ حکومت کی جانب سے ہو یا دو عادل اشخاص کی طرف سے یا جماعت مستفیضہ کی بہر حال قریبی شہروں کو شامل ہوگی اور جو شہر زیادہ دور واقع ہیں ان کو شامل نہ ہوگی۔ ابن عرفہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔

ابن البنا نے کہا، میرے باپ نے ذکر کیا اور وہ روایت کرتے ہیں ابو محمد بن بکر فاسیؒ سے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا ہم اسکندریہ کی رویت پر روزہ رکھیں تو آپ نے جواب دیا کہ نہیں (روزہ رکھنے کا حکم) ان شہروں کے لئے ہے جو ہم سے قریب ہوں اور زیادہ دور نہ ہوں۔ اور محمد بن سابق نے کہا کہ اہل قیروان مدینہ اور مکہ والوں کی رویت پر روزہ نہ رکھیں، اور یہی حکم دوسرے یا دور کے شہروں کا ہوگا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ غسانی اور حربی نے حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث کچھ اضافہ کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اہل نجد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ ان کی رویت مدینہ والوں کی رویت سے ایک دن پہلے ہو جاتی ہے۔ تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ہر شہر والوں کے لئے انہی کی رویت پر عمل ہوگا۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب بن عبد الرزاق اپنی کتاب (خلاصۃ العذب الزلال فی مباحث رویۃ الہلال) میں لکھتے ہیں کہ ابن رشد نے بدایہ میں کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ دور کے شہروں کی رویت معتبر نہ ہوگی جیسے اندلس اور حجاز۔ اور ابن جزی نے اپنی کتاب قوانین میں کہا ہے کہ جب ایک شہر والے چاند دیکھیں تو دوسرے شہر والوں پر بھی حکم لازم ہوگا، اس سے امام شافعیؒ کا بھی اتفاق ہے۔ اور ابن ماجشون نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ بہت زیادہ دور کے شہر والوں پر یہ حکم لازم نہ ہوگا۔ جیسے اندلس اور حجاز اور اسی پر اجماع ہے۔ ابن البنا اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ محمد بن نسیم نے اپنی کتاب المواقیت میں کہا ہے کہ علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ چاند دیکھنے والے کے معاملہ میں لمبی مسافت کا اعتبار کیا جائے گا اس صورت میں جس نے چاند دیکھا ہے اس کے لئے تو رویت ہوگی دوسرے کے لئے رویت نہیں ہوگی۔ جن لوگوں نے

رویت کے حکم کو علی الاطلاق لازم قرار دیا ہے اور اس میں چاند دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے دونوں کو بُعد و قرب کا فرق کئے بغیر برابر رکھا ہے انھوں نے اچھا نہیں کیا اور جو کچھ کہا وہ غلط کہا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو حکمت ہے اس کو اور بندوں کے حق میں اس کی جو حکمتیں ہیں اس کو نہیں سمجھا۔ ابن رشد نے بھی بدایۃ المجتہد میں کہا ہے کہ کیا جب ایک شہر والے چاند نہ دیکھ پائیں تو دوسرے شہر والوں کی رویت پر عمل کر سکتے ہیں؟ یا ہر شہر کے لئے انہی کی رویت ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ ابن القاسم اور مصری حضرات امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کسی شہر والوں کے نزدیک یہ ثابت ہو جائے کہ دوسرے شہر کے لوگوں نے چاند دیکھ لیا ہے تو جن شہر والوں نے اس دن میں روزہ نہیں رکھا اور دوسرے شہر والوں نے روزہ رکھا ہے تو انھیں اس دن کے روزے کی قضا لازمی ہے اور اس کے قائل امام شافعی اور امام احمد ہیں۔ لیکن مدینہ والوں نے مالکؒ سے روایت کی ہے کہ جس شہر میں رویت ہوئی ہے اس کی خبر کی بنا پر اس شہر والوں پر رویت لازم نہیں ہے جہاں رویت نہیں ہوئی ہے۔ مگر یہ کہ امام لوگوں کو اس کا حکم دیدے۔ اس کے قائل ابن ماجشون اور مغیرہ ہیں جو اصحاب مالک ہیں البتہ اس پر اجماع ہے کہ دور کے شہروں (مثلاً اندلس اور حجاز) میں ایک جگہ کی رویت کا دوسری جگہ اعتبار نہ ہوگا۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ لوگوں کا اس باب میں اختلاف ہے کہ جب کسی خبر دینے والے نے کسی شہر کی رویت کی خبر دی تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ خبر قریبی شہر کی ہوگی یا دور کے شہر کی، اگر قریب کی ہے تو دونوں شہروں کا ایک ہی حکم ہے۔ اور اگر دور کی ہے تو ہر شہر کی رویت انہی کے لئے ہے۔ یہ روایت حضرت عکرمہؓ اور قاسم اور سالم سے ہے حضرت ابن عباس اور اسحاق بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے امام بخاریؒ نے (لاھل کل بلد رویتھم) کا باب منعقد کیا ہے۔ قرطبی نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول اپنے غلام کریب سے کہ (ایسا ہی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے) کے بارے میں ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ

کا قول (ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس حدیث کے مرفوع ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اور آپ کا یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ شہر جب دور ہوں جیسے شام، حجاز سے دور ہے تو اتنی دوری پر رہنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی رویت ہی پر عمل کریں اور دوسری جگہ کی رویت پر عمل نہ کریں۔ بشرطیکہ ان پر یہ ثابت ہوجائے کہ امام یا خلیفہ لوگوں کو اس پر آمادہ نہیں کر رہا ہے۔ ورنہ اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

ابن عربی نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔ (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے خبر واحد ہونے کی وجہ سے تسلیم نہیں کیا اور اسے رد فرمادیا۔

(۲) کچھ لوگوں نے اس کے رد کرنے کی وجہ ملکوں کے مطالع کا اختلاف قرار دیا ہے۔ یہی صحیح بات ہے اس لئے کہ کریب نے شہادت نہیں دی بلکہ اس حکم کی خبر دی جو شہادت سے ثابت ہوچکا ہے۔ اور اس حکم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو خبر ثابت شدہ ہو اس میں خبر واحد کافی ہوتی ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے کہ اغمات والوں نے جمعہ کی رات میں چاند دیکھا ہے اور اشبیلہ والوں نے سنیچر کی رات میں دیکھا تو ہر شہر والوں کی انہی کی رویت معتبر ہوگی اس لئے کہ سہیل اغمات سے ظاہر ہوتا ہے اور اشبیلیہ سے ظاہر نہیں ہوتا اور یہ بات مطلع کے اختلاف پر دلالت کرتی ہے۔

خلاصۃ العذب الزلال میں لکھا ہے، قرآنی نے فروق میں کہا کہ: چاند کی رویت کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب چاند مشرقی شہروں میں شعاع میں ہوتا ہے اور سورج چاند کے ساتھ غربی سمتوں میں چل رہا ہوتا ہے اور جب مغرب کی افق میں پہونچے گا تو چاند شعاع سے باہر آجائے گا۔ اور مغرب کے باشندوں کو نظر آئے گا اور مشرق والوں کو اس روز شعاع میں رک جانے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے گا۔ دوسرے دن رات میں دکھائی دے گا۔ اور یہ بداہۃً معلوم ہے اور یہ رویت ہلال کے اختلاف کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس کے اور اسباب بھی ہیں جو علم ہیئت میں مذکور ہیں اور یہ بھی کہا کہ مطالع کے اختلاف کا اعتبار درست ہے۔ اور جو اس کے قائل نہیں ان کی مذمت کی ہے۔ قرافی نے فروق میں

یہ بھی کہا ہے کہ جب اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ نماز کے اوقات آفاق کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہر قوم کے لئے ان کی فجر، ان کا زوال اور ان کے دوسرے اوقات ہیں۔ تو یہی بات چاند کے بارے میں بھی لازم آ لے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مشرقی شہر میں چاند شعاع میں ہوگا اور سورج غربی سمت میں برابر چلتا رہے گا حتیٰ کہ جب مغرب کے افق میں پہونچے گا تو چاند شعاع سے باہر نکل آلے گا۔ اور اہل مغرب اسے دیکھ لیں گے اور مشرق والوں کو نظر نہیں آلے گا۔ یہ رویت ہلال کے من جملہ اسباب میں سے ایک سبب ہے اس کے اور بھی اسباب ہیں جو علم ہیئت میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں ہم نے جس قدر بیان کر دیا ہے وہ فہم مراد کے لئے کافی ہے۔ باقی اسباب کا ذکر مناسب نہیں ہے جب آفاق کے اختلاف سے چاند کی رویت میں اختلاف ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ چاند کے بارے میں ہر قوم کی رویت انہی کے لئے ہو، جیسا کہ ہر قوم کی فجر وغیرہ اوقات نماز میں ہوتی ہے اور یہی بات حق وصواب ہے۔ لیکن کسی شہر کی رویت سے تمام اقالیم میں روزہ کا وجوب، قواعد دلائل کے خلاف اور ان کے مقتضاء کے منافی ہے۔

ابن ماجشون کہتے ہیں کہ جس شہر میں شہادت ثابت ہوئی ہے اسی شہر والوں پر عمل لازم ہوگا۔ مگر امام وقت کے نزدیک ثابت ہو جائے تو تمام لوگوں پر لازم ہوگا۔ اس لئے کہ تمام بلاد اس کے حق میں ایک بلد کے مانند ہیں اس لئے اس کا حکم تمام میں نافذ ہے۔ اس کو صاحب عون المعبود نے ان سے نقل کیا ہے۔ پس یہ اقوال ائمہ مالکیہ اور ان کے محققین کے ہیں تو معلوم ہوا کہ سب لوگوں کے نزدیک اہل بلد کی رویت انہی کے لئے ہوگی۔ بالخصوص بعد بعید کے وقت جیسا کہ اس پر کریب مولیٰ ابن عباسؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول (اما نحن فلا نزال نصوم حتی نراه او نكمل العدة ثلاثين) وقال هكذا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم) پوری طرح واضح کرتا ہے کہ اہل مدینہ شام والوں کی رویت پر مسافت بعیدہ کی وجہ سے عمل نہیں کرتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان (صوموا لرؤيته) اور آپ کا ارشاد

(لا تصوموا حتیٰ تروہ ولا تفطروا حتی تروہ) اس بات میں صریح ہے کہ روزہ اور افطار سبب کے پائے جانے کے وقت ہی واجب ہوگا۔ اور اس کا سبب رویت ہے۔ اس کی نظیر نماز کے اوقات ہیں اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کے طلوع ہونے پر نماز فجر پڑھنے کا حکم دیا اور ظہر کی نماز کا سورج ڈھل جائے۔ اور عصر کی نماز کا جس وقت ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جائے۔ اور مغرب کی نماز کا جب سورج غروب ہو جائے۔ اور عشار کا جب شفق احمر ڈوب جائے پس یہ ہیں نماز کے اوقات تو کیا کہا جائے گا کہ تمام اہل ممالک اپنی اپنی نمازوں کی ادائیگی کے لئے مامور ہیں جب بھی سبب نماز پایا جائے خواہ وہ سبب مدینہ یا مکہ میں پایا جائے؟ مسلمانوں میں سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ بلکہ ہر اہل شہر کی انہی کی فجر، انہی کا زوال، انہی کا غروب شمس وغیاب شفق معتبر ہے۔ پس اسی طرح ہر اہل بلد کے لئے انہی کی رویت مراد ہوگی خصوصاً اس دوری کے ساتھ کہ دوسرے لوگوں کو چاند دیکھنا ممکن ہی نہ ہو۔ یہ بات بہت واضح اور روشن ہے اس پر کوئی غبار نہیں ہے۔ جیساکہ ائمہ محققین کے اقوال سے ثابت کر دیا گیا ہے۔

ائمہ شافعیہ اوران کے محققین کے اقوال

امام نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ جب کسی شہر میں لوگ چاند دیکھ اور دوسرے شہر والوں کو چاند نظر نہ آئے اور شہر بھی باہم قریب ہوں تو ان دونوں شہروں کا حکم ایک شہر کا حکم ہوگا اور دوسرے شہر والوں کو بھی باتفاق رائے روزہ رکھنا لازم ہوگا۔ اور اگر دونوں شہر دور واقع ہوں تو اس میں اختلاف ہے لیکن صحیح تر یہ رائے ہے کہ دوسرے شہر والے روزہ نہیں رکھیں گے یہی قطعی رائے مصنف ابو اسحق شیرازی کی ہے۔ اور شیخ ابوحامد اور بندیجی وغیرہم کی بھی یہی رائے ہے اور اسی کو عبدلای، رافعی اور اکثر علمائے دین نے صحیح بتایا ہے اور درست یہی ہے کہ جب دونوں شہروں میں دوری ہو تو ہر شہر کی رویت اسی کے لئے ہوگی۔ اس لئے کہ شہروں کے اختلاف کی وجہ سے طلوع اور غروب میں فرق ہو جاتا ہے۔ اور ہر قوم اپنے مطلع اور مغرب کی مخاطب ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کسی شہر میں فجر پہلے طلوع ہو جاتی ہے

اور کہیں دیر میں طلوع ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کہیں جلد ڈوبتا ہے اور کہیں دیر میں ڈوبتا ہے۔ اور ہر اہل شہر اپنے اپنے یہاں کے طلوع فجر اور غروب آفتاب کا اعتبار کرتے ہیں۔ ایسا ہی چاند کی رویت کا معاملہ بھی ہے"۔ اسی طرح علامہ ابن منذر نے عکرمہ، قاسم، سالم اور اسحٰق بن راہویہ سے نقل کیا ہے کہ دوسرے شہر والوں کی رویت پر عمل نہیں ہوگا اور امام ترمذی نے بھی یہی رائے اہل علم کی نقل کی ہے اس کے علاوہ کسی دوسری رائے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ عراقی شوافع اور صیدلانی وغیرہم نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ دوری کا مفہوم یہ ہے کہ مطالع مختلف ہوجائیں مثلاً حجاز، عراق، خراسان۔ اور قرب کے معنی یہ ہیں کہ مطالع میں اختلاف نہ ہو جیسے بغداد، کوفہ، ری، اور قزوین۔ امام نووی نے روضہ، منہاج اور شرح مہذب میں اسی رائے کو صحیح بتایا ہے۔ اور رملی نے نہایۃ المحتاج شرح منہاج میں جو کچھ کہا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "جب چاند کسی شہر میں دیکھا جائے تو اس کا حکم اس سے قریبی شہر میں لازم ہوگا۔ اس لئے کہ وہ دونوں شہر ایک ہی شہر کے حکم میں ہیں۔ جیسے مسجد کے پاس رہنے والوں کا حکم ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ جب شہر دور ہوں تو یہ حکم نہ ہوگا۔ مثلاً حجاز اور عراق، اور دوسری رائے یہ ہے کہ دور والے شہر پر بھی لازم ہوگا اور دوری سے مراد اتنی مسافت ہے جس سے قصر لازم آجائے۔ اس کو مصنف نے شرح مسلم میں صحیح بتایا ہے۔ اس لئے کہ شریعت نے اس کے ساتھ بہت سے احکام کو معلق کیا ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک بعید وہ شہر ہے جہاں مطالع میں اختلاف ہوجائے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہی زیادہ صحیح ہے واللہ اعلم۔ اس لئے کہ چاند کے حکم کا تعلق مسافت قصر سے کچھ نہیں ہے۔ اس حدیث کی رو سے جس کو مسلم نے حضرت کریب سے روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں نے شام میں چاند دیکھا پھر مدینہ پہنچا تو مجھ سے حضرت ابن عباسؓ نے پوچھا کہ تم نے چاند کب دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ جمعہ کی رات میں۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے بھی اسے دیکھا۔ میں نے کہا ہاں میں نے دیکھا اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا۔ ان لوگوں نے روزہ رکھا اور معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ ہم نے تو سنیچر کی رات میں چاند دیکھا ہے۔ ہم برابر روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ گنتی

پوری کرلیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت معاویہؓ کی رویت اور ان کا روزہ رکھنا آپ کے لئے کافی نہیں ہے؟ فرمایا نہیں، ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ طلوع فجر اور آفتاب کے طلوع اور غروب پر قیاس کر کے اور اس لئے کہ مطلع اور عرض البلد کے اختلاف سے کیفیت بھی مختلف ہوتی ہے اس لئے اس کا اعتبار ہونا چاہئے۔ رہا یہ سوال کہ مطالع کو سمجھنے کے لئے حساب کی ضرورت ہے اور ہیئت والوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ ان کی بات پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ بنیادی اور عام مسائل میں ان کی باتوں کا اعتبار نہ ہو تو ضمنی اور مخصوص مسائل میں بھی نہ ہو۔ اگر مطالع میں اتفاق نہ ہو تو اختلاف ہی سمجھا جائے گا اس لئے اصل عدم وجوب ہے اور رویت سے ثابت ہوتا ہے۔ بلا رویت قرب ثابت نہ ہونے کی وجہ سے وہ حکم بھی ان کے حق میں ثابت نہیں ہوا۔ ہاں اگر اتفاق واضح ہو جائے تو پھر ان پر قضا لازم ہوگی۔ تاج تبریزی نے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اختلاف مطالع چوبیس۲۴ فرسخ سے کم میں ممکن نہیں ہے اور والد محترمؒ نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ اور زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ مطلع کا اختلاف محدود ہے۔ اس پر بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔ اور علامہ سبکی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ مطالع جب مختلف ہوں تو شرقی شہروں کی رویت غربی شہروں کے لئے لازم ہے مگر غربی شہر والوں کی رویت مشرقی باشندوں کے لئے ضروری نہیں ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بہت طویل بحث کی ہے اور اسنوی وغیرہ نے بھی ان ہی کی پیروی کی ہے۔ یعنی یہ کہ جہاں سمت اور عرض متحد ہوں وہاں لزوم ہو سکتا ہے۔ اسی جگہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اگر دو وارث مر جائیں جن میں ایک مشرق میں رہتا ہے اور دوسرا مغرب میں اور ہر ایک کی موت اپنے اپنے زوال کے وقت ہوئی ہے تو غربی شرقی کا وارث ہوگا کیوں کہ اس کے لحاظ سے شرقی کا زوال پہلے ہوا ہے۔

تعارف وتبصرہ

سہ ماہی
تحقیقاتِ اسلامی
پر ایک نظر

ڈاکٹر عبد المغنی

'تحقیقات اسلامی' کو خدا کا شکر ہے اہلِ علم نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ رسالہ کی تعریف و تحسین میں جو خطوط آتے رہے ان کی اشاعت کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر عبد المغنی نے رسالہ کی نگارشات کی محض تعریف ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کے بعض مندرجات پر تنقید بھی کی ہے۔ اب کی بار تعارف و تبصرہ کے عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب کی یہی تحریر پیش کی جارہی ہے۔ تحقیقات اسلامی کے منجھے ہوئے اہلِ قلم امید ہے اس تنقید کا خوش دلی سے استقبال کریں گے اور ہمارے عام قارئین کو بھی اس سے فائدہ پہونچے گا۔ جلال الدین

عصرِ حاضر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا چرچا عام ہے، یہاں تک کہ بعض ان حضرات نے بھی اس موضوع پر کام شروع کیا جو اسلامی نظریۂ زندگی اور نظام حیات سے کم ہی واقفیت رکھتے ہیں اور کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں رکھتے، بلکہ ان کا مقصد زیادہ تر اسلام میں جدید خیالات کا پیوند لگا کر مسلمانوں کو کسی نام نہاد ترقی کی دوڑ میں لگانا ہے یا پھر دنیا کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا عذر پیش کرنا ہے۔ دوسری قسم کے حضرات وہ ہیں جو عصرِ حاضر کے مسائل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان سے آگاہ بھی کم ہیں، بس پرانی باتوں کو ایک ڈھنگ سے

جمع کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن نئے زمانے میں ان کا مصرف اور موجودہ حالات پر ان کا انطباق دکھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

بلاشبہ ماضی قریب میں علامہ شبلی، علامہ ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی اور سب سے زیادہ علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کے نظریہ و نظام کی بہترین ترجمانی عصر حاضر میں کی ہے اور علامہ اقبال نے اس ترجمانی کو اپنی دقیقہ سنجی اور نغمہ آفرینی سے دلوں کی دھڑکن بنا دیا ہے۔ لہٰذا یہی بزرگ کم از کم ہند و پاک کی حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار ہیں اور انھیں کے کارناموں نے وہ فضا بنائی ہے جس میں نئی نسلوں کی اسلام پسندی پروان چڑھی ہے۔

اس فضا کو پھیلانے اور بڑھانے کے لئے ایسے مستعد صالح ذہنوں کی ضرورت تھی جو ایک ٹیم بن کر کسی ادارۂ تصنیف و اشاعت کے ذریعہ تازہ بہ تازہ موضوعات و مسائل پر اسلامی تعلیمات و معلومات کو بلا خوف و خطر اور بلا رورعایت پیش کریں اور قدیم و جدید کو باہم و دگر مربوط کر کے اقدامی انداز سے بات کریں، سب سے بڑھ کر یہ کہ قدیم علوم اور ان کی معلومات کے عظیم الشان خزانے کو جدید اسلوب سے دنیا کے سامنے لا کر دور حاضر کی ذہنی کم مائگی اور اس سے پیدا ہونے والی کم ظرفی کا علاج کریں تاکہ بیسویں صدی عیسوی کا علمی توازن درست ہو، جو کم نظر مرعوب اور کم علم مستشرقین کے غرور نفس اور فریب کاریوں کے سبب برہم ہو چکا ہے۔

"ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی" علی گڑھ اور اس کا ترجمان "تحقیقات اسلامی" اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ادارہ کے نگراں مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب اپنے علمی و تصنیفی کمالات اور کارناموں کے لئے دینی حلقوں میں معروف ہیں اور اس کے مدیر مولانا سید جلال الدین عمری اس کار عظیم کے لئے بہت ہی موزوں بھی ہیں اور مستعد بھی جو اس ادارے اور رسالے نے اپنے ذمے لیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" کے چار شمارے جنوری سے دسمبر ۸۲ تک کے ہیں، جو ایک سال کی

علمی کاوشوں کی روداد سناتے ہیں۔

ہر شمارہ کے شروع میں فہرست مضامین ہوتی ہی ہے۔ لیکن چوتھے شمارہ کے آخر میں چاروں شماروں کی فہرست یکجا بھی دے دی گئی ہے۔ اس فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مستقل ومبسوط مقالے بھی ہیں اور مختصر ومفصل تبصرے بھی، خالص علمی موضوعات بھی ہیں اور عملی مسائل بھی، لکھنے والوں میں ہندوستان کے بھی علماء ہیں اور عالم عرب کے بھی۔ قدیم فقیہہ بھی ہیں اور جدید دانشور بھی۔ اداریہ، مقالہ، تلخیص، تعارف سب کچھ ہے۔ مذہبی، تاریخی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی، ہر قسم کے مباحث ہیں۔ ان تمام تحریروں میں قدر مشترک اسلامی نقطہ نظر اور علمی طرز بیان ہے، جو اوّل تا آخر ہر شمارے اور سبھی شماروں میں موجود ہے۔

ایک تعارفی تبصرے میں ممکن نہیں کہ مذکورہ بالا مضامین پر تفصیل کے ساتھ کوئی گفت وگو کی جائے، نہ ہی تمام تحریروں کو زیر بحث لانا مناسب ہوگا۔ لہٰذا چند چیزوں کو بہ طور نمونہ لے کر اختصار کے ساتھ بعض نکات پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ اسلامیات سے دل چسپی رکھنے والے اور تازہ ترین علمی رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے "تحقیقات اسلامی" کی کاوشوں کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

مولانا جلال الدین عمری صاحب کے اداریے بہت فکر انگیز اور رسالے کے مقاصد کے لئے نہایت موزوں و موثر ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں موضوع کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں اور ہر جہت سے قرآن وحدیث کے دلائل کثرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں قصہ آدم وحوا اور مسلمان مرد وعورت کے لئے ایمان وعمل صالح کی اہمیت پر انھوں نے جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان قدیم موضوعات کے تمام پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسی طرح ظلم سے کمزور کی حفاظت اور مظلوم کے دفاع جیسے جدید مباحث پر انھوں نے اسلام کی تعلیمات وہدایات بڑی قابلیت کے ساتھ واضح کردی ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر یہ ہے کہ اپنے موضوع کے ایک ایک نکتے بلکہ ہر ہر جزئیے کو الگ الگ کھول کھول

بیان کرتے ہیں اور ہر خیال کے لئے کتاب اللہ کی آیات اور سنت رسول اللہ کی روایات سے استشہاد کرتے ہیں۔ اس طرح قاری کو متعلقہ مضمون پر اسلام کے احکام کا تعین اور تفصیل کے ساتھ علم ہو جاتا ہے۔

مولانا صدر الدین اصلاحی اپنے مباحث کو زیادہ طول نہیں دیتے، صرف چند ضروری اور بنیادی امور کو لیتے ہیں، پھر کتاب و سنت سے بھی نمایاں ترین دلائل پیش کرتے ہیں، اور سارا زور زیر بحث موضوع کے تجزیئے پر صرف کرتے ہیں۔ ان کے انداز تحریر میں بڑی جامعیت ترتیب و تنظیم اور حسن بیان ہے۔ مسلمان باپ کی ذمہ داریاں اور بنی اسرائیل کی مصر واپسی جیسے قدیم موضوعات پر انھوں نے ایک انفرادیت و جدت کے ساتھ اور بعض نئی معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لغات القرآن پر بھی عبور رکھتے ہیں اور الفاظ کے معانی کا ماہرانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ بحث بہت ہی منطقی اور مربوط ہے اور طرز بیان پر معنی و اثر انگیز۔

ڈاکٹر لیسین مظہر صدیقی نے عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموال غنیمت کے تناسب پر اعداد و شمار اور حقائق سے لبریز فاضلانہ بحث کر کے فیصلہ کن طریقے پر مستشرقین کے جاہلانہ و متعصبانہ الزامات کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ اس موضوع پر مصنف نے تحقیق و تفتیش کی زبردست کاوشیں کی ہیں اور وہ اپنے مواد پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن شان نزول کے سلسلے میں بہت ساری معلومات فراہم کر لینے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنقیدی بصیرت سے کام نہیں لے سکے، اور صاف دماغی کے ساتھ کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہنچے، وہ اس موضوع پر بعض عظیم ترین مفکرین اسلام کے خیالات پر محاکمہ تو کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ خالص دینی موضوع مصنف کے ذہن کے لئے سازگار نہیں معلوم ہوتا، لہٰذا اگر وہ اپنے مطالعات مستشرقین کے اسلامی تاریخ پر کئے گئے الزامات کی تردید اور اس سلسلے میں زیر بحث آنے والے معاشی و سیاسی موضوعات تک محدود رکھیں تو عصر حاضر میں اسلام کی ایک شاندار، علمی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

جناب سلطان احمد اصلاحی نے مساوات کے تصور پر مذاہب عالم کی تعلیمات کے متعلق ایک بہت مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور دور جدید کے اس اہم موضوع پر خاصی معلومات فراہم کرلی ہیں۔ ان کا طریق مطالعہ مبصرانہ اور طرز بیان سلیس و رواں ہے۔

ڈاکٹر محمد ذکی نے خانۂ کعبہ اور رسالت محمدی کے مضامین کو ایک علمی بحث کا موضوع بنایا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ناقابل تردید دلائل اور دستاویزی شہادتوں سے، جن میں متعدد مخالفین اسلام ہی کی مقدس کتابوں سے لی گئی ہیں، ثابت کردیا ہے کہ خانۂ کعبہ اور رسالت محمدی کی اصلیت و حقیقت وہی ہے جو قرآن حکیم واضح کرتا ہے، نہ کہ وہ جو غیر مسلم بالخصوص مسیحی علما اپنی ناقص معلومات اور معاندانہ تعصبات کے سبب بتانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری نے تعداد ازدواج کے مسئلے پر پرزور عقلی دلائل اور بصیرت افروز معلومات کے ذریعے نہایت ہی عالمانہ و فاضلانہ طور پر اسلامی نقطۂ نظر کی حکمت و افادیت ثابت کردی ہے اور اس سلسلے میں مسلم پرسنل لا پر کئے جانے والے سارے اعتراضات کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ شریعت اسلامی سے بہتر کوئی عائلی قانون انسان کے لئے نہیں ہے اور جو لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی نے بڑی خوبصورتی سے تصوف میں پیر کے تصور کی حقیقت اس کے علم برداروں ہی کے بیانات سے واضح کرکے اس کا سراسر غیر شرعی اور شرک آمیز ہونا بالکل ثابت کردیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی نے امام ابن تیمیہ کے معاشی نظریات کا انکشاف کرکے قدیم علمائے اسلام کی جدید ترین موضوعات پر دسترس اور خالص دنیوی سمجھے جانے والے مسائل پر ان کے حکیمانہ نقطۂ نظر کا ایک بین ثبوت فراہم کردیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تمام ضروری معلومات مہیا کرکے انھیں عالمانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اگر وہ

اس موضوع کو جاری رکھتے ہوئے دوسرے قدیم ائمہ اسلام کے معاشی تصورات کا بھی سراغ لگائیں تو عصر حاضر میں اسلام کی ایک اہم خدمت انجام دیں گے۔

مولانا محمد تقی امینی کے مضمون میں حوالے اور معلومات تو ہیں مگر مربوط اور واضح انداز انداز میں مرتب و منظم طریقے پر بحث و تجزیہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حکمت کی جو تشریح انھوں نے کی ہے اس میں بعض غیر متعلق امور کی شمولیت کے سبب اس لفظ کا مفہوم معین نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر بدری محمد فہد نے مسلمان قاضیوں کا تذکرہ کر کے واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جامع تصور عدل کی ترجمانی و تعمیل کے ایک نہایت ضروری اور اہم گوشے پر فاضلانہ طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔

جناب انوار علی خاں سوز نے مسلم اساسیت پر لکھتے ہوئے اساسیت کے مفہوم اور ارتقاء پر اچھی گفت و گو کی ہے اور اس سلسلے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن ان کی نظر صاف نہیں ہے اور ذہن بالکل الجھا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ مسلم اساسیت کی توضیح و تعیین تو کیا کرتے، بعض ایسے بیانات صادر کرتے ہیں جو سراسر غلط اور مغالطہ انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر بہاء اللہ اور غلام احمد قادیانی کے ساتھ مہدی سوڈانی کا ذکر اور یہ تاثر دینا کہ اول الذکر دو کی طرح آخر الذکر نے بھی کوئی دینی فرقہ بنایا، جب کہ یہ معلوم و معروف ہے کہ بہاء اللہ اور غلام احمد دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مہدی سوڈانی ملتِ اسلامیہ کے ایک مصلح سمجھے جاتے ہیں۔ پھر دوسری جگہ، راسخ العقیدہ شمار کئے جانے والوں کے بارے میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ دین میں اضافہ کو صحیح سمجھتے ہیں، یہ ایک بالکل بے بنیاد بات ہے اور اس کے اندر صریحاً تضاد بیان پایا جاتا ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی طرف جو نظریہ ارتقاء اور اشتراکی تصور ملکیت منسوب کیا گیا ہے یا یہ بات جو کہی گئی ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض لوگ نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں، مشتبہ اور مغالطہ آمیز ہے۔ دراصل یہ پورا مضمون دفاعی اور عذر

خواہانہ قسم کا ہے جس میں اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی وغیرہ کو فنڈامنٹلسٹ کہنے والوں کو ایک الزامی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس طرز بحث کا نتیجہ انتشار خیال کی شکل میں نکلا ہے۔ اساسیت پسندی کا مطلب اگر دین کے اساسی تصورات کا احیاء ہے تو یہ عین اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عمل ہے۔ اس پر نہ شرمانے کی ضرورت ہے نہ خود الجھ کر دوسروں کو الجھانے کی۔

ڈاکٹر عبدالباری نے ہشام کی سیاسی حکمت عملی پر معلومات افزا مضمون لکھا ہے۔ اسی موضوع پر وہ دیگر اہم خلفاء کے متعلق بھی لکھیں تو اچھا ہو۔ جناب عبدالباری ایم اے نے مسجد اقصیٰ اور اس کے ماحول کی قدیم تاریخ پر اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر احمد سجاد نے عاصم بہاری جیسے ایک گم نام سماجی کارکن کی خدمات پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند بالکل بنیادی تصورات ہی محل نظر ہیں۔ جو مسلمان پیشے کے لحاظ سے بنکر رہے ہیں انھیں 'مومن' یا 'انصاری' قرار دینا محض ستم ظریفی ہے اور اس سے احساس کم تری اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ طبقہ پرستی اور فرقہ بندی کی بو آتی ہے۔ مومن تو ہر مسلمان ہے، نہ کہ محض ایک خاص طبقے کے اہل ایمان، اور انصاری تو خود سید السادات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نانہال کی طرف سے تھے۔ انصار ہونا ایک بات ہے، جو صحیح ہے اور انصاری کہلانا بالکل دوسری بات، جو محض ایک مغالطہ ہے۔

اس تبصرے سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر رسالے کو لکھنے والوں کی ایک ایسی ٹیم کا تعاون حاصل ہے جس کے افراد باصلاحیت، باشعور، ذی علم اور اسلام پسند ہیں اور گرچہ ان میں سے بعض ابھی زیادہ معروف نہیں مگر مشہور و معمر علمائے مغرب کی اسلام کے خلاف کی جانے والی پختہ سازشوں کا پردہ بخوبی چاک کر سکتے ہیں اور دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ علم اور علمی دیانت داری کیا ہے اور جہل اور علمی بددیانتی کیا۔ پھر نئے نئے مسائل و مشکلات کا اسلامی حل پیش کرنے کی استعداد بھی یہ تازہ کار علمائے اسلام رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت ہی مسرت کی اور نہایت امید افزا بات یہ ہے کہ رسالے کو اس کے مرکز اشاعت علی گڑھ،

میں مسلم یونیورسٹی کے جدید وجدید مسلم اسکالروں کا تعاون حاصل ہے اور وہ استقلال کے ساتھ اس سلسلے میں کاوشیں کر رہے ہیں۔

یوں تو رسالے میں ہر طرز و اسلوب کے مضامین ہیں، لیکن زیادہ کامیاب اور موثر وہی ہیں جن میں واقعات کی کھتونی کرنے اور اعداد وشمار کا انبار لگانے کی بجائے ایک معین نقطۂ نظر سے زیر بحث موضوع کے مضمرات کو ضروری دلائل وحقائق کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، اور انھیں پڑھ کر قاری کو صاف صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ معاملے کی اصلیت و اہمیت کیا ہے۔ یہی وہ پختہ، مرتب، منطقی، واضح اور موثر سلیقہ تحریر ہے جو کسی تحریک کو آگے بڑھانا اور تنظیم کو کامیاب بناتا ہے، ورنہ محض حوالوں اور اقتباسوں سے خام مواد فراہم کر دینا کوئی تصنیفی کارنامہ نہیں ہے، فقط ایک کوشش تالیف ہے۔ اسی طرح دفاعی کی بجائے اقدامی انداز اختیار کرنا بھی علمی و عملی دونوں قسم کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

رسالے میں بعض عرب علماء کے مضامین یا ان کے علمی کارناموں پر تبصرے بھی موجود ہیں۔ عرب وہند کے مسلم علماء کے درمیان یہ تعارف اور تبادلۂ خیال نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اور اس سے اردو پڑھنے والوں کو علوم اسلامی میں عربی کے تازہ ترین ذخیرے سے واقفیت حاصل ہوگی۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے کو اور بڑھایا جائے۔

تحقیقات اسلامی میں ادب کے موضوع کو بھی شامل کر لیا جائے تو بہتر ہو۔ اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً اسلام پسند ادیبوں کی تعمیری کوششوں کا جائزہ لینا کافی ہوگا۔ تخلیقی ادب معاشرے پر وسیع طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی تحقیق و تنقید بھی ضروری ہے۔

جو حضرات سہ ماہی تحقیقات اسلامی یا ادارہ تحقیق و تصنیف کو چیک یا ڈرافٹ کی شکل میں تعاون کرنا چاہیں وہ اس پتہ پر تعاون فرمائیں IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-E-ISLAMI ALIGARH

استدراک ـــــــــــ ڈاکٹر اسرار احمد

محترمی ! السّلام علیکم

آپ کے رسالہ "تحقیقات اسلامی" کی جلد ۱۰ شمارہ ۴ میں شائع شدہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مضمون "عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموال غنیمت کا تناسب" اس وقت پیش نظر ہے اس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے بعض باتوں پر کچھ زیادہ احتیاط اور غور و فکر سے کام نہیں لیا ہے۔ جہاں تک اس کے تاریخی بیانات کا تعلق ہے اس میں بھی جگہ جگہ ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن تاریخ کا طالب علم نہ ہونے کی وجہ سے اسے میں اپنی کم علمی پر محمول کرتا ہوں۔ البتہ مضمون میں چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ریاضی کے لحاظ سے بے احتیاطی نہایت واضح ہے۔ جو کسی علمی اور سنجیدہ مضمون میں نہیں ہونی چاہئے۔ مثلاً:

غزوۂ بدر میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کے سلسلہ میں صفحہ نمبر ۱۲ کے دوسرے پیراگراف میں یہ کہا گیا ہے "..... مویشیوں میں ایک سو پچاس (۱۵۰) اونٹ اور دس (۱۰) گھوڑے تھے ......" جب کہ صفحہ ۱۳ کے دوسرے پیراگراف میں یہ ذکر ہے "..... روایت ہے کہ سپاہیوں کو ایک اونٹ اور کچھ سامان ملا تھا، کچھ کو دو اونٹ اور باقی کو کچھ کھالیں ......" چونکہ اسی پیراگراف کے مطابق میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے والے تین سو تیرہ (۳۱۳) سپاہی تھے اس لئے روایت کے مطابق حاصل شدہ اونٹوں کی تعداد کم سے کم تین سو تیرہ (۳۱۳) ہونی چاہئے۔ جو پہلے بیان کی گئی تعداد سے دوگنی سے زیادہ ہے۔

صفحہ ۱۳ پر لکھا ہے "غزدہ بدر میں مسلم فوج کو عظیم الشان فتح کے نتیجہ میں کافی مال غنیمت ملا ......" لیکن ص ۱۴ پر فرماتے ہیں "سپاہیوں کو ایک اونٹ اور کچھ سامان ملا تھا۔ کچھ کو دو اونٹ اور باقی کچھ کو کھالیں۔ گویا دو اونٹ معیاری حصہ تھے، ..... یہ بہت ہی حقیر رقم تھی۔ اور اسی بنا پر جیسا کہ واقدی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین کو کم مال غنیمت ملنے سے

ملال ہوا تھا"۔ ان دونوں عبارتوں میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔

صفحہ ۲۱ پر اوپر سے تیسری سطر میں مجموعی رقم پچپن ہزار اسی دینار، اوپر دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ریاضی کے کس اصول کے تحت نکالی گئی ہے سمجھ سے باہر ہے۔

صفحہ ۲۵ کے دوسرے پیراگراف میں غزوۂ حنین میں حاصل شدہ مال غنیمت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے: "........اس میں چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکری... نقد حاصل ہوا تھا..... البتہ بارہ ہزار مسلم سپاہ میں ہر شہسوار کو بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بھیڑ بکری اور ہر پیادہ کے حصہ میں اس کے ایک تہائی آئے تھے ....."

اب اگر یہی فرض کرلیا جائے کہ بارہ ہزار سپاہ میں سے ہر ایک کو صرف چار اونٹ اور چالیس بھیڑ بکریاں ملیں جو شہسوار کے حصہ کا تہائی ہے تو بھی اونٹوں کی کل تعداد اڑتالیس ہزار اور بھیڑ بکریوں کی چار لاکھ اسی ہزار ہوتی ہے۔ یہ تعداد پہلے بیان کی گئی تعداد سے کافی زیادہ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات پر فاضل مضمون نگار نے مختلف روایتوں کو غور و فکر کئے بغیر یکجا کر دیا ہے۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کی بعض اہم تصانیف

اسلام — ایک نظر میں اس کتاب میں مولانا موصوف نے اسلام کے عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق، معاشرت اور سیاست تک تمام پہلوؤں کا جامع تعارف کرایا ہے۔ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کا انگریزی، ہندی، بنگلا اور ملیالم زبانوں میں بھی ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔

دین کا قرآنی تصور اس فکر انگیز کتاب میں مولانا نے ایک طرف تو اس غلط تصور دین کی مدلل تردید کی ہے جو مدتوں سے مسلمانوں کے اندر نفوذ کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف قرآن کی روشنی میں دین کا صحیح تصور نکھار کر پیش کیا ہے۔ قیمت ۸ روپئے

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶